مقالاتِ بریلوی

سید الطاف علی بریلوی

پیش لفظ

پروفیسر محمد معین الدین دردائی

بی۔ اے (آنرز) ایم اے (علیگ)

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

۱۹۷۳ء

مقالاتِ بریلوی

سید الطاف علی بریلوی

پیش لفظ

پروفیسر محمد معین الدین دردائی

بی۔ اے (آنرز) ایم اے (علیگ)

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

۱۹۷۳ء

ناشر

ڈائرکٹر، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

متصل سرسید گورنمنٹ گرلس کالج

بی۔روڈ۔ ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸

طبع اوّل

تعداد ـــــــــــــــ ایک ہزار

قیمت ـــــــــــــــ

طابع

ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس۔ کراچی

۱۹۷۲ء

مقالاتِ بریلوی



مصنف

سیّد الطاف علی بریلوی

۳۱ - دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء

نئے پاکستان کے نام

جس کی

آزادی ، سالمیت ، ترقی اور خوشحالی

مُصنّف کا نصب العین ہے

سیّد الطاف علی بریلوی

فہرست مضامین

(۱)

تاثرات

(۲)

تعلیمات

(۳)

سیاسیات

(۴)

اَدبیَات

(۵)

انتقادیات

(۶)

شخصیات

پیش لفظ

پیش لفظ

پروفیسر محمد معین الدین دردائی بی۔ اے۔ (آنرز) ایم۔ اے (علیگ)

سید الطاف علی بریلوی کے نام اور کام سے تو میں ۱۹۳۵ء سے ہی واقف تھا جب کہ وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کے سر دفتر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بی۔ اے آنرز کا طالب علم تھا لیکن وہاں ان سے ملنے کی توفیق مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ سید صاحب علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور علی گڑھ برادری کے ناتے میرے "بڑے بھائی" بھی ہوئے لیکن حلقۂ علی گڑھ میں اساتذہ اور طلباء کے اندر جو اُن کو عزّ وجاہ اور مقبولیت حاصل تھی، پھر ایجوکیشنل کانفرنس میں ان کے کارنامے کے چرچے سن سن کر ذرا کچھ ان سے مرعوب سا رہا اور ان سے ملنے میں پہل نہ کی۔ اسے آپ میری بدتوفیقی یا احساس کمتری جو چاہیں سمجھ لیں۔

۱۹۳۸ء میں ام۔ اے۔ کر کے میں کچھ عرصہ کے لئے انجمن ترقی اُردو ہند (دہلی) میں ہندوستانی ڈکشنری مرتب کرنے کے سلسلے میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے چلا گیا۔ لیث صاحب اور اپنے دوسرے احباب اور اساتذہ سے ملنے میں اکثر دہلی سے علیگڑھ جاتا رہتا تھا لیکن بدقسمتی سمجھئے اس زمانہ میں بھی مجھے سید صاحب سے ملنے کی توفیق نہ ہوئی حالاں کہ میں ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے خاصہ متعارف تھا۔ علی گڑھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر کی تنظیم نو، اور شاندار عمارتیں کھڑی کر کے

انھوں نے جو عوام اور علمی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا اس کی گونج اور غلغلہ سے میرے کان آشنا تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں اپنے کاموں کی لگن اور جوش واستقلال کی وجہ سے سید صاحب اس وقت ملک گیر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "حیاتِ حافظ رحمت خاں"، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جیسے اہلِ علم اور اہل نظر بزرگ سے سرِ مجلس تحسین و توصیف کے یہ چند جملے کہلوا کر اربابِ علم وبصیرت کو چونکا چکی تھی۔

"صاحبو! ان بریلوی نے ایک لاجواب کتاب لکھی ہے جسے میں تین بار پڑھ چکا ہوں۔ ہنوز سیری نہیں ہوئی ہے۔ کتاب اپنے ساتھ لایا ہوں"۔

۱۹۴۱ء میں سید الطاف علی بریلوی صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ہندوستان کے علمائے علم وتحقیق کی ایک "مجلسِ مصنفین"، وہیں علیگڈھ میں قائم کی جس کے تحت برابر علمی جلسے منعقد ہوتے تھے اور ان مجالس میں ملک کے ادبا اور دانشور علمی و تحقیقی مقالے پڑھتے تھے۔ وہ تمام مقالے مجلس کے سہ ماہی مجلہ "مصنف" علی گڑھ میں سید صاحب کے اداریہ اور شذرات کے ساتھ شائع ہوتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء تک جاری رہا جس کے دوران مصنف کے بائیس ۲۲ شمارے شائع ہوئے اور وہ پرچے میری نظر سے گذرتے رہے اور میں ان کا دل سے قدر دان اور اس کے ایڈیٹر کی علمی بصیرت کا معترف بھی رہا لیکن پھر بھی سید صاحب سے ملنے میں اللہ جانے کیوں میں نے پہل نہ کی اور میری بد توفیقی قائم رہی۔

———— ✕ ————

دہلی سے بیمار ہو کر میں اپنے وطن پٹنہ چلا گیا اور جب صحت ہوئی تو وہاں ایک کالج سے وابستہ ہو گیا۔ اور سید صاحب سے ملنے کی آرزو دل کی دل میں ہی رہی۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور اس سے کچھ پہلے بہار میں قتل عام ہوا۔ لوگ متوحش ہو کر ادھر
اُدھر بھاگنے لگے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ جو تھا وہ سہما ہوا اور گھبرایا ہوا۔ ہر شخص بدحواس
جائے پناہ کا متلاشی ۱۹۴۸ء میں میں بھی مشرقی پاکستان کے ایک کالج میں منتقل ہو گیا اور
وہیں رہا۔ بہت عرصہ بعد جب کراچی آیا تو کبر سنی کے ساتھ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو چکا
تھا۔ حسن اتفاق سے ابھی کچھ سال پیشتر اکرام احمد صاحب مالک مشتاق بکڈپو سے بر سبیل
گفتگو سید الطاف علی بریلوی صاحب کا ذکر آیا تو وہ ان کے جاننے والوں میں نکلے۔ ان سے سید
صاحب کے تفصیلی حالات معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ اور ان سے ملنے کی "دیرینہ آرزو"
جسے میری "بد توفیقی" نے اب تک دبا رکھا تھا کلبلانے لگی۔ تقریب ملاقات کے طور پر میں نے اپنی
ایک "تازہ تصنیف "لسانی مطالعے" کی ایک جلد ان کی خدمت میں اکرام احمد صاحب
کے ذریعہ تحفۃً بھجوادی۔ جواب میں ان کا جو خط آیا اس سے پتہ چلا کہ سید صاحب بھی
مجھ سے اس وقت سے غائبانہ متعارف ہیں جب میں ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ میگزین کا اڈیٹر
تھا۔ اور وہ میری اکثر تصانیف کو پڑھتے بھی رہے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں میری
کتاب "تاریخ سلسلہ فردوسیہ" کا انہوں نے حوالہ بھی دیا تھا۔ مزید لطف یہ کہ میری
ان سے رشتہ داری بھی نکل آئی۔ میرے بھتیجے میاں وسیم[1] بلخی کی شادی ان کی بڑی صاحبزادی
سے ہوئی تھی خط کے بعد وہ وسیم سلمہ اور اپنی صاحب زادی کو ساتھ لیکر میری اس
وقت کی قیام گاہ ملیر کالونی خود تشریف لائے اور میں اپنی محبت کی کشش کو مان گیا ع

"خود چلے آئیں گے وہ درد جگر ہونے تو دو"

اس وقت سے میری عقیدت اور محبت ان سے برابر بڑھتی ہی جاتی ہے اور میں ان
کو اپنا بھائی، دوست، ہمدرد اور محسن سمجھتا ہوں۔ ہم مشربی اور ہم خیالی بڑی چیز

---

[1] پاکستان بننے کے بعد بھائی رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ پٹنہ مرحوم کے بچے پاکستان چلے آئے تھے اور میں انکے حالات سے بالکل بے خبر تھا

ہوتی ہے۔ اصلی اور دیرپا تعلقات اسی بنا پر قائم ہوتے ہیں اور اسی میں انسان کے ایثار اور قربانی کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔

سید صاحب کے بارے میں میرے تاثرات بہت بلند ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ ایک قابل اعتماد دوست اور شریف انسان پایا۔ وہ جس سے ملتے ہیں خلوص دل سے ملتے ہیں اور ہر وقت اس کے آڑے وقتوں میں کام آنے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ طبیعت میں وضعداری، انکساری، سادگی اور رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، عزیزوں کے ساتھ ان کا برتاؤ نرمی اور محبت کا، دوستوں کے ساتھ خلوص و رواداری کا اور دشمن کے ساتھ عفو اور درگذر کا ہوتا ہے۔

سید صاحب کا تعلق بریلی (روہیل کھنڈ) کے ایک ذی عزت متوسط الحال مشہدی سید خاندان سے ہے۔ آپ کے والد اور دادا تجارت پیشہ بزرگ تھے اور اپنے وطن اور معاصرین میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بریلی میں ان کا شمار اہل الرائے اور باوضع شرفا میں تھا۔ بریلی کے۔ ای۔ آئی۔ ام۔ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد مقامی کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ ایک سال کے بعد مسلم یونیورسٹی چلے آئے۔ اور وہیں سے ۱۹۲۶ء میں بی اے پاس کرکے ایل ایل۔ بی۔ کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن قدرت کو ان سے دوسرا علمی، سماجی، اصلاحی اور فلاحی کام لینا تھا اس لئے وکالت کی ڈگری نہ لے سکے اور وہ اپنے علمی، اصلاحی اور فلاحی کاموں میں لگ گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی ابتدا سیاسی اور سماجی کاموں سے کی تھی اور اس سلسلہ میں بریلی میں "انجمن نوجوانانِ اسلام" قائم کرکے بہت سے مفید تعلیمی اور سماجی کام انجام دیئے۔ بالخصوص اسلامیہ انٹرمیجیٹ بوائز اور گرلز کالجوں کی یادگار خدمت انجام دی پھر آگے چل کر ان

کا رخ علمی کاموں کی طرف مڑ گیا اور انہوں نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب "حیات حافظ رحمت خاں" پیش کر کے علماء اور دانشوروں سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ حیاتِ حافظ رحمت خاں سید صاحب کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

سید صاحب کی علمی اور تصنیفی زندگی کی ابتدا ۱۹۳۴ء سے اسی کتاب کے بعد ہوئی اس کتاب نے ایک طرف مسلمانوں کی تاریخی عظمت، قومی غیرت اور ملی شعور کو اجاگر کرنے میں غیر معمولی کام انجام دیا تو دوسری طرف خود سید صاحب کو علمی حلقوں میں روشناس کرایا اور آگے چل ان کو اسی نے علمی، تعلیمی اور تصنیفی راستہ پر ڈال دیا جس کے راہی وہ بفضلہٖ اس وقت تک ہیں اور بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔

حیات حافظ رحمت خاں کی ابتدا میں وہ خود لکھتے ہیں۔

"۱۹۳۵ء سے تادم ِ تحریر مسلمانانِ پاک و ہند کی تعلیمی و علمی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے کے مواقع بھی مجھے اس کتاب کے طفیل حاصل ہوئے۔"

اس کتاب نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو ان کی طرف متوجہ کیا اور پھر ان کی نظر کیمیا اثر نے ۱۹۳۵ء میں ان کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سر دفتر کے عہدے پر پہنچایا جس کا ذکر وہ اپنی اس کتاب کی ابتدائیہ میں اس طرح کرتے ہیں:-

جب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو نواب صاحب نے میری تصنیف کا ذکر کر کے فرمایا کہ ہمیں کام کا آدمی مل گیا ہے اس لئے دوسری درخواستیں

دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آں مرحوم و مغفور کی مولانا سید طفیل احمد منگلوری مرحوم اور استاذی پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب نے پُرزور تائید کی۔ اور وہ دن اور آج کا دن ہے کہ میں مالی نقطۂ نظر سے تو نہیں البتہ علمی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے اعتبار سے خاصا کامیاب اور مرفہ الحال ہوں۔"

ایجوکیشنل کانفرنس کے سر دفتر کی حیثیت سے انہوں نے بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ تقریباً پندرہ سال اس منصب پر رہے۔ جس کے دوران انہوں نے سارے ملک میں اس کی ساکھ قائم کردی اور ایک طرح پر اس کو تعلیمی تحریک کا ایک فعال مرکز بنا ڈالا۔

قیام پاکستان کے بعد جون ۱۹۵۰ء میں جب وہ حالات سے مجبور ہو کر کراچی پہنچے تو ایجوکیشنل کانفرنس کی تجدید، تعلیمی تحریک اور تالیف و تصنیف کا سودا یہاں بھی ساتھ لائے۔ گوشت کو ناخن سے، مچھلی کو پانی سے ممکن ہے جدا کر دیا جائے لیکن سید صاحب کو تعلیمی تحریک اور تالیف و تصنیف کے مشاغل سے ایک لمحہ کے لئے بھی علیحدہ رکھنا ممکن نہیں۔ ان مشاغل کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی :۔

"سید الطاف علی بریلوی صاحب کو اُردو ادب سے جو شغف رہا ہے اس کا اندازہ کرتا ہوں تو میرے دل میں خیال آنے لگتا ہے کہ اگر کسی دن صبح کے وقت ان کی آنکھ کھلے اور یہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار کسی ویران لق و دق جزیرے میں پائیں تو سب سے پہلے ان کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ

تصنیف وتالیف کا کوئی ادارہ جلد سے جلد یہاں کیوں نہ قائم کر دیا جائے"۔ (مقدمہ ۱۸۵۷ء کے ہیرو از انیس فاطمہ)

سید الطاف علی صاحب نے واقعی حرف بہ حرف بالکل یہی حرکت کی، کراچی کے بے آب وگیاہ دشت میں پہنچتے ہی انہیں سب سے پہلے ایجوکیشنل کانفرنس کی تجدید اور تعلیمی سرگرمیوں کی تشکیل کا خیال آیا اور انہوں نے اپنے مقامی مہاجر احباب کی امداد خاص اور حکومت پاکستان کی سرپرستی حاصل کر کے ۱۹۵۱ء میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو قائم کر کے اس کے تحت سہ ماہی جریدہ 'العلم' کا اجرا کیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری اور العلم کی ادارت کی ذمہ داری خود اپنے کاندھوں پر لی اور بیس برس کی مختصر مدت میں کانفرنس کی طرف سے سرسید گرلس کالج، ادارۂ تصنیف وتالیف (اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ) ایک شاندار کتب خانہ، پبلک ریڈنگ روم اور میوزیم قائم کر کے اپنی کارگزاریوں کا عوام وخواص کو معترف بنا کر چھوڑا۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے تحت اب تک ستر سے زیادہ علمی وتحقیقی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو نگی نا ناظم آباد میں ۱/۲ ۵ ایکڑ زمین پر سرسید گرلس کالج کی اپنی شاندار عمارت بن چکی ہے اور اب گذشتہ سال کانفرنس کی بھی اپنی عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔

سید صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صحیح معنوں میں "پراڈکٹ" ہوئے ہیں۔ ان میں علی گڑھ والوں کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مادرِ تعلیم گاہ نے تحریر وتقریر دونوں کی صلاحیتیں ان میں ایک ساتھ ودیعت کی ہیں۔ اردو اور انگریزی میں ان کی تقریریں پُر اثر اور تحریریں انفرادی طرز کی حامل ہوتی ہیں۔ کافی کتابوں کے مصنف اور بے شما-

مضامین کے خالق ہیں۔ طبیعت میں علی گڑھ والوں کی بذلہ سنجی، بے تکلفی اور خلوص و ہمدردی پائی جاتی ہے۔ خدمتِ خلق اور اخوت کا جذبہ جو مرحوم علیگڑھ کالج کا طرۂ امتیاز تھا اس سے پوری طرح بہرہ ور ہیں۔

سید صاحب میں ایک خاص بات جو مجھے نظر آتی ہے وہ ان کی قلندریت اور صوفیہ کا سا استغنا ہے، ان کے پاس پیسے آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ وہ اپنا ذاتی مکان بنواتے ہیں اور پھر جب ذاتی یا قومی کاموں میں روپے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس شان سے بیچ دیتے ہیں جیسے بیچنے کے لئے ہی بنوایا ہو۔

گہہ بر طارمِ اعلیٰ نشینم　　　گہہ بر پشتِ پائے خود نہ بینم

کے اصول پر ان کے یہاں آرام و تکلیف میں کوئی خاص فرق نہیں پایا جاتا۔ وہ مشکلات سے نہیں گھبراتے، بلند بانگ دعوں اور نمود و نمائش کا ان کے یہاں مطلق گذر نہیں وہ اپنی کمزوریوں کو بھی بڑی سادگی سے بیان کر جاتے ہیں جس کی مثالیں ہمیں طالب العلم کی ڈائری میں بہ کثرت ملتی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے وہ ہمارے ہی خاندان کے ایک فرد ہوں اور جنہیں ہم ہمیشہ سے جانتے ہوں۔ "راہی اور راہ نما" اور "چند محسن چند دوست" میں ہمیں ان کے تجربات سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا ہے، اس میں بھی ان کی سادہ اور بے ریا طبیعت کا بار بار اندازہ ہوتا ہے۔

سید صاحب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے رفقائے کار کو آگے بڑھانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں، وہ خود پیچھے رہ کر اپنے نوجوان ساتھیوں کو علمی میدان میں آگے بڑھا دیتے ہیں۔ ان کی اس خصوصیت نے اردو کو کئی اچھے لکھنے والے دیئے کل کے نوجوان لکھنے والے آج کے کہنہ مشق مصنف اور محقق کی حیثیت سے علم داں رب

کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب سید الطاف علی بریلوی صاحب کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ان کے رسالہ 'العلم' یا دوسرے جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ سید صاحب نے اس مجموعہ کا نام "مقالاتِ بریلوی" رکھ کر اس کو چھ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، یہ تقسیم انہوں نے نفسِ موضوع کے لحاظ سے کی ہے۔

پہلے حصہ کا عنوان انہوں نے تاثرات، دوسرے کا تعلیمات، تیسرے کا سیاسیات، چوتھے کا ادبیات، پانچویں کا انتقادیات، اور چھٹے کا شخصیات رکھا ہے۔ ہر عنوان کے کے تحت متعلقہ موضوع پر کئی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

اس سے پہلے ان کے مضامین کا ایک اور ضخیم مجموعہ "تعلیمی مسائل۔ پسِ منظر اور پیشِ منظر" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ ان دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ "تعلیمی مسائل۔ پس منظر اور پیش منظر" میں تاریخی پس منظر کے ساتھ خالص تعلیمی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ جب کہ پیش نظر مجموعہ "مقالات بریلوی" رنگا رنگ مضامین کا گلدستہ ہے۔ اس مجموعہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سید صاحب کے طرزِ تحریر کی کئی خوبیاں سامنے آگئی ہیں۔ سید صاحب کا اصل میدان تو تاریخ و صحافت ہے اور اس میں ان کا قلم خوب سرپٹ دوڑتا ہے، لیکن اس مجموعہ کے پہلے حصے تاثرات کو پڑھ کر ہمیں ان کے طنز و مزاح کی صلاحیتوں کو بھی ماننا پڑتا ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں طنز و مزاح کی ایسی مرغوب چاشنی ہمیں ملتی ہے کہ پڑھ کر لطف آجاتا ہے

تعلیمات کے تحت اس مجموعہ میں سید صاحب کے کئی بہت اہم اور دقیق مقالے

شامل کئے گئے ہیں۔ اور ان کا شائع ہونا بے حد ضروری تھا۔ یوں تو سیاسیات، انتقادیات ادبیات سب ہی عنوانات کے تحت مضامین کارآمد اور مفید ہیں لیکن مجھے سید صاحب کے تخصیات پر بڑا مزا آیا۔ شخصیات سید صاحب کا موضوع خاص ہے۔ اور اس کے تحت انہوں نے جو کچھ لکھا ہے بہت لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

شخصیات پر لکھتے وقت سید صاحب اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کا قلم ان کے دل و دماغ کا آئینہ ہو جاتا ہے۔ ان کی بے ریائی۔ سادگی اور محبت روزِ روشن کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس مجموعہ میں بعض ایک ورق اور دو ورق کے بھی مضامین شامل ہیں۔ مضمون نگاری کی حیثیت سے ممکن ہے یہ زیادہ اہم نہ سمجھا جائے لیکن لکھنے والے کے جذبات کی آئینہ داری کی بنا پر ان کی بڑی اہمیت ہے۔

سید صاحب کے اسلوبِ تحریر کی ایک بڑی خصوصیت اس کا تخیلی حاشیہ آرائی سے پاک ہونا ہے۔ ان کے یہاں اچھوتا اندازِ استدلال تو کافی پایا جاتا ہے لیکن مضمون میں خیال آرائی کا وہ بہت کم سہارا لیتے ہیں۔ سرسیدؔ اسکول کے اسلوب نگارش سے وہ زیادہ متاثر ہیں۔ سرسید کی طرح انہوں نے بھی اپنی نثر نگاری لئے ایڈیسن اور اسٹیل کا اسلوب پیش نظر رکھا ہے اور اس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بڑا تیز ہے، وہ سماجی تغیرات اور حالات کے ساتھ انسان میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان سے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔

معین الدین دردائی کراچی ۲۲ نومبر ۱۹۷۲ء

مُصنّف کی دوسری کتابیں

حیاتِ حافظ رحمت خاں (اصل اُردو)
طبع اول ۱۹۳۴ء طبع دوم ۱۹۶۳ء قیمت دس (۱۰) روپیے

" " " (انگریزی ترجمہ)
مطبوعہ ۱۹۶۶ء " بیس (۲۰) روپیے

طالب علم کی ڈائری
" ۱۹۵۹ء " تین "

راہی و راہ نما
" ۱۹۶۴ء چار "

تعلیمی مسائل پس منظر اور پیش منظر
" ۱۹۶۵ء آٹھ "

" تعلیم و تعلم
" ۱۹۶۶ء سات "

حاصلِ مطالعہ
" ۱۹۶۷ء آٹھ "

چند محسن چند دوست

پانچ روپے	مطبوعہ ۱۹۶۹ء	

علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں

بارہ "	" ۱۹۷۰ء	

لہ قیام پاکستان سے قبل کی کتابیں بجز ۱ اب دستیاب نہیں ہیں۔

ملنے کا پتہ

صدر دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

تاثرات

موضوع کی تلاش!

رسالہ "العلم" کی ترتیب۔ اس کے "اداریے" اور "شذرات" یا آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی شائع کردہ کتابوں کے "مقدمے" "تعارف" اور "پیش لفظ" وغیرہ کا سپردِ قلم کرنا بھی لکھنے میں کچھ لکھنا ہوا۔ یہ تو میرے کاروباری مشاغل کا جزو ہیں۔

ایک جاندار نصب العین کے تحت کسی ایسے موضوع پہ لکھنا اور دن رات لکھتے رہنا جس میں روحانی اُپج طبیعت کی نمو اور جودت و جولانی کو بھی دخل ہو۔ ہمہ وقت ذہن و دماغ پر اُسی کی دُھن سوار ہو اور روزانہ کام ختم کرنے کے بعد دل کو اطمینان ہو کہ آج کا دن ضائع نہ ہوا۔ ایسا کوئی موضوع کئی سال ہو گئے ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ پڑھتا ہوں، ایک سے ایک بلند پایہ کتاب زیرِ مطالعہ رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی بے مقصد اور اوقاتِ فرصت میں محض اپنے کو مصروف رکھنے کے لئے ۔۔۔ اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما سے معلومات اور عبرت و موعظت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مصرف ۔۔۔ محض غم دوراں سے کچھ دیر کے لئے چھٹکارا حاصل کرنا ہوتا ہے اور بس!

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

تاریخ سے مجھے دلچسپی رہی ہے۔ کئی کتابیں لکھیں۔ بکثرت مقالے اور مضامین ضبطِ تحریر میں لایا۔ اہلِ علم نے انھیں پسند بھی کیا۔ مگر اب اس کثرت سے ایک سے ایک عمدہ کتاب شائع ہو رہی ہے اور تحقیق و تدقیق کا معیار اس

قدر بلند ہوگیا ہے کہ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ علاوہ ازیں تاریخ کے معاملہ میں یہ مشکل بھی ہے کہ شاہانِ سلف اور ان کے کارناموں کا بیان آج کی جمہوریت پسند دنیا میں بے مصرف ہوگیا ہے۔ سابقہ غیر ملکی حکمرانوں کی بداعمالیوں۔ لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تعدی کے واقعات بھی سب کو معلوم ہو چکے ہیں۔ اپنا ملک آزاد ہوگیا اور کل کے ظالم اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ اب ان کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

تعلیمی مسائل

پر غور و فکر اور توسیع تعلیم کے لئے عملی کام اور تحریری پروپیگنڈا کرتے ہوئے قریب قریب چالیس سال کا زمانہ گزر چکا ہے، جب تک لوگ تعلیم کی جانب راغب نہیں ہوئے تھے اور حکومت و برادرانِ وطن کی طرف سے طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں۔ اس وقت تک بڑے جوش و خروش کے ساتھ کام ہوتا رہا۔ لیکن اب ہر شخص بغیر کسی ترغیب و تحریص کے تعلیم حاصل کرنے کا دلدادہ ہے، یہ دقت ضرور ہے کہ کافی تعداد میں تعلیمی ادارے موجود نہیں اور پڑھنے والوں کے ذرائع اور وسائل محدود ہیں، تو اس سلسلہ میں بس یہی کام باقی رہ جاتا ہے کہ حکومت سے تعلیم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی اپیلیں کی جائیں، عرضداشتیں بھیجی جائیں، اور سرمایہ داروں کی خوشامد کی جائے کہ للہ فی اللہ۔ اس کار خیر میں مدد کریں۔ آج کی نوخیز نسلیں اپنا مستقبل سدھارنے اور ملک کو استحکام بخشنے کے لئے انتقاماً تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ان کی تائید و حمایت میں بھی تھوڑا بہت لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کے لکھنے لکھانے کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا۔ تعلیم کا ایک اور مسئلہ تعلیم یافتہ لوگوں کی بے روزگاری ہے۔ لڑکے تو

لڑکے صدہا ایم اے اور ایم ایس سی لڑکیاں بیکار ہیں۔ اور وقت گذاری کے لیے بعض اوقات ان کو پرائمری اسکولوں تک میں جگہ نہیں ملتی۔ میرا تعلق لے دیکر صرف سرسید گرلس کالج کراچی سے ہے تو اس میں ظاہر ہے کہ ان کی محدود تعداد ہی یہاں کھپت ہوسکتی ہے۔

شعر و ادب کے میدان میں لکھنے والوں کی تعداد ماشاء اللہ بحد و حساب ہے اور صدہا ایسے ایسے صاحب طرز انشاپرداز اپنے قلم کی بہار دکھا رہے ہیں، کہ ان کے مقابلہ میں کوئی چیز پیش کرتے ہوئے خاصی جھجک محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے جب تک ادب مقصدی نہ ہو محض الفاظ کی میناکاری بے معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ اصناف ادب میں تنقید اور افسانہ نگاری کافی اہمیت رکھتے ہیں لیکن تنقیدی مضامین و مقالات عوام کی دلچسپی کے نہیں ہوتے اور خواص اہل علم بربنائے رشک و منافقت ان میں طرح طرح کے کیڑے نکالتے ہیں۔ رہے مختصر اور طویل افسانے تو ان میں تا وقتیکہ فحاشی اور عریانیت کی چاشنی نہ ہو، مقبول نہیں ہوسکتے۔ افسانے کی تکنیک اور فن کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ اس کا انجام المیہ پر ہو کیونکہ زندگی تمام تر المیہ ہی تو ہے۔ اور اگر المیہ نگاری کی جائے تو میرا اپنا نظریہ ہے کہ ہماری قوم جس کو روتے اور رلاتے ہوئے دو سو سال گذر گئے ہیں اب اس کو مزید رونا نہ چاہیئے بلکہ جوش و خروش کے ساتھ تعمیری کام کرکے انفرادی و جماعتی زندگی کی مسرتوں میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ جو افسانہ اس نقطۂ نظر سے لکھا جائیگا وہ فنی اعتبار سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔

علمی و تحقیقی مقالات اگر واقعی ان کا حق ادا کیا جائے تو وہ خلاصے اوق ہو جاتے ہیں عام قاری کے پلے نہیں پڑتے اور علمائے

تحقیق خود اپنے کاموں میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ انھیں دوسرے کی لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھنے کی نہ فرصت اور نہ ضرورت، لہٰذا یہ کوہ کندن و کاہ برآوردن بھی لاحاصل ہی نظر آتا ہے۔

شکاریات اور سفرنامے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ خوب پڑھے جاتے ہیں لیکن یہ بڑا مہنگا کھیل ہے، مجھ جیسا متوسط الحال شخص نہ شکار کے مصارف برداشت کر سکتا ہے اور نہ اخراجاتِ سفر کا متحمل ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ ایک شاہ جہانپوری اہلِ قلم کی طرح چین جائے بغیر صرف کتابیں پڑھ کر چین کا ایک ضخیم سفرنامہ لکھ دیا جائے۔ یا مرزا فرحت اللہ بیگ کی تقلید میں سمندر کی صورت دیکھے بغیر صرف قیاساً انڈونیشیا کا آنکھوں دیکھا حال تحریر کر دیا جائے۔

سوانح اور خاکہ نگاری اس میدان میں دوڑ کر دیکھ لیا، ہم جس شخص کو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں اس کا چونکہ کسی نہ کسی فرقہ یا عقیدہ سے تعلق ہوتا ہے یا وہ کسی ایسی قوم اور ملک کا فرد ہوتا ہے جس نے کبھی ہماری ملت کو نقصان پہنچایا ہے تو اس کے بارے میں ہماری رائے فتنہ و فساد کی موجب ہو سکتی ہے، تحریر میں کتنے ہی اعتدال و توازن سے کام لیا جائے لیکن اعتراضات ہو کر رہیں گے۔ نہ خالص مداحی سے کام چلتا ہے اور نہ عیب جوئی سے۔ بالآخر یہی سوچا کہ کہ خود اپنی ذات کونسی پاک و منزہ ہے کہ دوسروں کی اور وہ بھی مرے ہوئے لوگوں کی۔ اسکریننگ کو شعار بنایا جائے۔

آرٹ اور کلچر سو کلچر کی آج تک سرے سے تعریف ہی نہ ہوسکی یہ وہ عنقا ہے جس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ صرف قیاس آرائی سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلامی کلچر۔ اس کو کون سے زمان و مکان سے وابستہ کیا جائے ہمارے علمائے دین تک کے رہن سہن اور لباس و خوراک کے طریقے قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں سے میل نہیں کھاتے۔ رہی آرٹ کی بات، تو آجکل تجریدی آرٹ کا بول بالا ہو رہا ہے جو اپنی فہم سے بالاتر ہے۔ فن تعمیر و تزئین میں بھی کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا چل رہا ہے اور ہم اس پر نہ تو اسلامی یا غیر اسلامی کا ٹھپہ لگا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی خوبی کو سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

سیاسیات ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر لکھنے کے لئے کوئی روزانہ یا کم از کم ہفتہ وار اخبار ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ تاکہ جلد جلد بدلتے ہوئے حالات میں نتائج افکار و مشاہدات ہاتھ کے ہاتھ طبع ہو جائیں۔ ماہانہ یا سہ ماہی رسالے اور کتابیں تھوڑے ہی عرصہ میں بعد از وقت ہو جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اپنے ملک کے مفاد میں یہ ہر کس و ناکس کا کام بھی نہیں ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں دخل دے۔ ہمارے سربراہانِ مملکت دوسرے ملکوں سے نہ معلوم کتنی دوستی یا کتنی مخالفت کو ضروری سمجھتے ہیں، پھر محکمۂ خارجہ کے پاس جو اطلاعات ہوتی ہیں وہ ایک عام مُبصر کے پاس نہیں ہوسکتیں۔ اور بربنائے عدم واقفیت سنگین غلطیاں ہونے کا امکان ہے۔ رہی اپنے ملک کی سیاست تو عرض ہے کہ سیاسی پارٹیاں اور قومی اخبارات خوب ہی خوب کام کر رہے ہیں۔ اور میں چاہوں بھی تو اس میں کوئی اضافہ نہ کرسکونگا۔

ویسے بھی کسی رہنما اور اُس کی جماعت کی موافقت یا مخالفت کرتے ہوئے بڑا ڈر لگتا ہے کہ نہ معلوم کل کلاں کو اُس کا کیا حشر ہو۔ انگریز اور ہندو حاکموں سے نجات مل جانے کے بعد اپنے مسلمان حاکموں سے وفاداری البتہ اپنا جزوِ ایمان ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ دور ہے لیکن ان کے لئے نئی معلومات کا ہونا ضروری ہے۔ معلومات بھی معمولی نہیں بلکہ نظری عملی اعتبار سے ان میں ماہر ہونا ناگزیر ہے۔ مہارت کے فقدان نے مجھے اس لائن میں ناکارہ بنا دیا ہے۔ ویسے بھی نئی نئی سائنسی تحقیقیں اور ایجادیں اس قدر تیزی سے ہو رہی ہیں کہ چند سال بیشتر کی چیزیں آناً فاناً پرانی ہو جاتی ہیں اور سب کیا دھرا بیکار ہو جاتا ہے۔ مجھ جیسا اطمینان اور سہولت سے لکھنے والا کوشش بھی کرے تو سائنس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اخلاقی و سماجی اصلاح پرانا مضمون ہے بہت کچھ عملی کام کیا اور اس پر کافی لکھا بھی لیکن بظاہر کسی قسم کا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ افرادِ ملت اور مختلف سماجی طبقات نے جو معاشرت اور اخلاقی قدریں اپنے لئے مقرر کر لی ہیں کوئی لاکھ سمجھائے وہ ان میں تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہیں مضمون میں لکھی ہوئی اچھی اچھی باتوں سے اتفاق کیا جائیگا۔ ان کی تعریف کی جائے گی لیکن عمل جوں کا توں رہے گا۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ ہر مصلح اور ریفارمر کو پہلے خود اپنی اور اپنے متعلقین کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ اثر پذیری کے لئے یہ لازمی شرط ہے قول و عمل کے تضاد نے تمام نیک کوششوں اور دعووں کو مضحکہ خیز بنا دیا ہے اور صرف اسی وجہ سے ہماری نوخیز نسلیں انھیں

سُننے تک کو تیار نہیں ہیں۔ اس خصوص میں میں نے جب اپنے قول وعمل کا جائزہ لیا تو طبیعت بے طرح شرمائی اور "او خود گم است کرا رہبری کند" کے احساس نے اشہبِ خامہ کی ساری توانائی سلب کرلی۔

صنعت وحرفت اور تجارت بڑے اہم موضوع ہیں اور ملکی معیشت کو اغیار کے دباؤ سے آزاد کرانے اور خود کفیل بنانے کے واسطے ان پر جس قدر بھی زورِ قلم صرف کیا جائے کم ہے لیکن ان شعبوں میں روزافزوں ترقی کے باوجود اشیائے صرف کی گرانی نے پریشان کردیا ہے۔ ہمارے ملک کے صنعت کار، اہلِ حرفہ اور تاجر صاحبان کی دولت وثروت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہورہی ہے مگر نوّے فیصدی عوام اور متوسط الحال لوگوں کی بدحالی خوشحالی میں تبدیل ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کاش میں نے معاشیات (اکنامکس) کا علم حاصل کیا ہوتا اور صنعتی وتجارتی ترقی کے نتیجہ میں روزافزوں بڑھتی ہوئی گرانی کا راز مجھے معلوم ہوجاتا تو اپنی تحریروں کے ذریعہ میں اپنے اہلِ ملک کو صبر وقناعت کی پرجوش تلقین کرتا۔ لیکن جب میں خود ہی گم گشتہ راہ ہوں تو کسی کو کیا راستہ دکھاؤں۔

زراعت یہ خوب ہی خوب ہوا کہ صدیوں پرانا زمینداری اور جاگیرداری کا ظالمانہ نظام ختم ہوگیا مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کا طبقہ بدستور اپنے پورے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رونق دہِ حیات ہے اور سُنا ہے کہ کاشتکار لوگ ویسے ہی مفلوک الحال ہیں۔ ہم خود چونکہ شہر میں رہتے ہیں اور دیہاتوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوتا لہٰذا خدا کرے یہ اطلاع غلط ہو۔ البتہ اشیاء خورونوش کی زبردست گرانی کے ہم شہری لوگ بھی شدت کے ساتھ شکار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ

چونکہ آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور کھانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے خوراک کی قلت وگرانی ہوگئی ہے۔ بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ گزشتہ بیس۲۰ سال کے عرصہ میں آبادی میں زیادہ سے زیادہ تین۳ فیصد کا اضافہ ہوا ہے تو اسی تناسب سے گرانی بڑھ جاتی۔ یہ سَو اور دو سَو۲۰۰ فیصد گرانی کیوں ہے؟ ممکن ہے کہ ناجائز برآمد (اسمگلنگ) اور چور بازاری (بلیک مارکٹنگ) کی وجہ سے بے برکتی ہوگئی ہو لیکن اس کی خاطر خواہ روک تھام تو ہماری مضبوط حکمراں قیادت بآسانی کر سکتی ہے۔ بہر حال جب تک ٹھیک ٹھیک اور مستند طور پر صورت حال معلوم نہ ہو اس پر قلم اٹھانے کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔

الغرض مندرجہ بالا موضوعات نیز دوسرے بکثرت مباحث پر لکھنے والے برابر لکھ رہے ہیں۔ ایک ہم ہی ہیں جو کچھ عرصہ سے ذہنی رکاوٹوں اور خیالی الجھنوں میں مبتلا ہو کر لکھنے سے معذور ہوگئے ہیں۔ ایک قسم کا تصوراتی اور تخیلاتی خلا ہے جس میں ہم اپنے کو گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

افق پر کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں نظریں اٹھتی رہتی ہیں۔ اور کبھی کبھی کوئی کام کی بات بھی دھیان میں آجاتی ہے مثلاً خیال گزرا کہ دو سو سال تک ہمارے ملک اور دوسرے اسلامی ممالک پر یوروپین استعمار اور تہذیب و تمدن کا تسلط رہا جس کے نتیجہ میں مراکش سے انڈونیشیا تک ہم اپنی پچاس فیصد اسلامیت اور اسلامی اسپرٹ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب اس وقت اشتراکی اثر و نفوذ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اشتراکی ملکوں نے غریب عوام اور محنت کش طبقوں کو ابھارنے اور انھیں کی

نہایت منظم حکومتیں قائم کر کے جو شاندار کامیابی حاصل کی ہے اس سے سارے جہان کی آنکھیں خیرہ ہو گئی ہیں۔ سرمایہ دار .... طاقتوں نے سالوں سال جمہوریت عوام کی روک تھام میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن چونکہ ہتھیاروں کی دوڑ میں بھی اشتراکی ممالک نے برتری حاصل کر لی ہے اس لئے بے بسی ہو گئی۔ خود اسلامی ممالک کے مفاد کے خلاف اشتراکی ملکوں بالخصوص چین نے کوئی اقدام نہیں کیا بلکہ جب کبھی ان پر کوئی مصیبت پڑی تو ہر طرح کی امداد و ہمدردی سے دریغ نہ کیا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکی طاقتوں کی مخالفت کرنے یا ہر شعبۂ زندگی میں ان کے زور شور سے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کوئی عذر باقی نہ رہا۔ اس صورت حال کے پیش نظر یو روپین جارحیت کے بعد اشتراکیت کی بدولت ہماری بقیہ پچاس فیصدی اسلامیت کا کیا انجام ہوگا؟ یہ ایک نہایت اہم اور غور طلب مسئلہ ہے۔ ہمیں اشتراکیت سے کوئی تصادم کرنا نہیں ہے اور نہ ہم کر ہی سکتے ہیں کیونکہ اس کے بکثرت اصول، نظریات اور عملی پروگرام اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ دینی عقائد و عبادات کا البتہ فرق ہے۔ اس فرق کو اپنی اسلامی انفرادیت و تشخص کی خاطر برقرار رکھنا وقت کی نہایت اہم ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے قرآن کریم، احادیث نبوی، اور تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کر کے ان میں اسلامی سوشلزم کا از سر نو پتہ لگانا ناگزیر سا ہو گیا ہے۔ نہ صرف نظری اعتبار سے بلکہ عملی طور پر اسلامی اقتصادی و معاشی نظام کی اشاعت کی جائے نیز ہماری اسلامی حکومتیں خیر القرون کی مثال سامنے رکھ کر طریقۂ حکمرانی اور تقسیم دولت میں انقلاب برپا کریں۔ مقصد تو طبقاتی کشمکش اور انسانی اونچ نیچ کو دور کرنا ہے۔ جو

اسلامی تعلیمات کی بدولت بخوبی دور ہو سکتی ہے۔ اگر مزید بے عملی سے کام لیا گیا تو جس طرح ہم یوروپین تہذیب واستعمار کے تابع ہو گئے تھے آئندہ اشتراکی نظام حکومت ونظریات کے حامی ومناد ہو جائیں گے۔

مندرجۂ بالا انکشافِ ذہنی کے تحت ہم ارادہ کر رہے تھے کہ اپنی بقیہ زندگی اب اسی کام پر صرف کر دیں گے کہ اتنے میں اخبار "ڈان" کے ذریعہ ادارۂ اسلامی کراچی کے ترجمان "چراغِ راہ" کا "سوشلزم نمبر" شائع ہونے کی اطلاع نظر نواز ہوئی جسے پڑھ کر خوشی ہوئی کہ لیجیے جو کام ہم کرنے والے تھے اس میں شاید توارد ہو گیا۔ اور ہمارے کچھ کیے دھرے بغیر ہی مقصد براری کی راہ نکل آئی۔

"چراغِ راہ" کا مذکورہ ۵۲۵ صفحات کا "سوشلزم" نمبر منگا کر مطالعہ کروں گا جس کے بعد یہ فیصلہ ہو سکے گا کہ آئندہ لکھنے کے لئے مجھے جس موضوع کا القا ہوا تھا ادارۂ اسلامی والوں نے اب اس میں کچھ جان چھوڑی بھی ہے یا سب کچھ لکھ دیا۔ آخر الذکر صورت پیش آئی تو میں پھر بیکار ومعطل ہو کر کسی "نئے موضوع کی تلاش" میں سرگرداں ہو جاؤں گا۔

(مارچ ۱۹۶۰ء)

"باتیں ہی باتیں"

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو خود بڑھ کر اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

دو سو سال تک انگریزوں کی مسلسل غلامی اور زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں کے مقابلہ میں احساس کمتری نے برّصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو جن کی اکثریت اب پاکستان میں ہے۔ بزدل اور پست ہمت بنا دیا ہے۔ ہر وقت غمزدہ رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اور اگر کسی وقت تفریح کی بھی جائیگی تو اس میں پست ذہنیت اور بد مذاقی کا مظاہرہ ایک طرح کی قومی خصوصیت بنکر رہ گئی ہے۔ پہلے ہم رعایا تھے۔ اب عوام ہیں اور ہماری حالت دودھ پیتے بچوں سے بدتر ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے سہارے اور مدد کی ضرورت ہے۔ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ میں مصنف ہوں کوئی میری کتاب چھپوا دے اور فروخت کر دے، مجھے گھر بیٹھے معاوضہ کی رقم مل جائے۔

میں اخبار نویس ہوں۔ اپنے کو صرف ملازم سمجھتا ہوں۔ اخبار جس سے میرا تعلق ہے مالی اعتبار سے فیل ہو جائے یا کامیاب ہو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں مجھے تو مہینے کے آخر پر تنخواہ ملنی چاہیئے۔

میں پروفیسر یا ٹیچر ہوں آمدنی کی خاطر پڑھاتا ہوں، میرے طالبعلم بالیاقت ہوں یا بے لیاقت مجھے کوئی غرض نہیں۔ منتظمینِ ادارہ خواہ چوری کریں

خواہ ڈاکہ ڈالیں مگر مجھے روپیہ دیں۔ میں سرکاری ملازم ہوں بسرکار کا غلام ہوں۔ ترقی کی راہیں میرے لئے مسدود ہیں۔ مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں اوقاتِ دفتر میں صرف وہاں موجود رہوں۔ کام کرنا اور حکومت کو مستحکم کرنا میرا فرض نہیں ہے۔ اس کام کو افسرانِ بالا کریں کیونکہ وہ بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں موٹر اور بنگلوں کے مالک ہیں۔

میں افسر ہوں۔ مجھے اپنی قابلیت۔ تجربہ اور سیاسی جوڑ توڑ پہ ناز ہے۔ زیادہ آمدنی نے مجھے خدا سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ملکی فلاح اور انسانی ہمدردی کے کام میرے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ پہلے میں انگریز کا ایک معزز افسر تھا اب پاکستان کا اعلیٰ افسر ہوں۔

میں وزیر تھا۔ وزیر بننے کے لئے قدرت نے مجھے پیدا کیا ہے۔ مجھے عمر بھر وزیر ہی رہنا چاہیئے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ پاکستان قائم رہے یا ختم ہو جائے۔ میری وزارت اور اُس کا وجود لازم و ملزوم ہیں، وزارت جاتی رہی تو ملکی و قومی خدمت سے مجھے کیا سروکار۔ پہلے میں دوبارہ وزیر بن جاؤں اس کے بعد سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

میں زمیندار اور جاگیردار ہوں۔ عیش کوشی۔ آرام طلبی اور حکام رسی میرا پیشہ ہے۔ کاشتکار میرے غلام ہیں ان کی مفلوک الحالی سے مجھے کیا مطلب، یہ لوگ اُسی طرح پشتینی غریب ہیں جس طرح میں پشتینی رئیس ہوں۔ اُن کی تنگ دستی اور جہالت میرے لئے کار آمد ہے۔ روپیہ اور علم اُن کو مل گیا تو سرکش ہو جائیں گے۔ میری مرضی کے تابع نہ رہیں گے اور اُن کے ووٹ بھی قبضے

سے نکل جائیں گے جن کے ذریعہ میں اسمبلی یا پارلیمنٹ کا ممبر بنتا ہوں اور حکومت میری بات مانتی ہے۔

میں تاجر اور کارخانہ دار ہوں۔ اپنے چند بچوں اور ایک دو بیویوں کے لئے اتنی دولت جمع کرنا ——— اتنی جمع کرنا کہ قارون کو بھی اس کا تصور نہ ہوا ہو۔ میری زندگی کا واحد نصب العین ہے۔ اشیائے خوردنی و پوشیدنی کی روز بروز ہولناک گرانی، عوام کی قوتِ خرید کا تیزی سے گھٹنا اگرچہ خطرہ کی چیزیں ہیں۔ لیکن جب تک یہ خطرہ کوئی ضرر رساں شکل اختیار کریگا میں اور میرے متعلقین ہر قسم کی زد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ پاکستان پر کیا موقوف ہے دُنیا کے جس حصے میں چاہوں گا چلا جاؤں گا اور عیش کی زندگی بسر کروں گا۔

ہماری پست ذہنیت اور کوتاہ اندیشی کا یہ مرقع کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہر جگہ اور ہر شخص کی زبان پر اس کا چرچا ہے لیکن صرف ذکر اور چرچا ہے۔ اصلاح حال کے لئے عملی اقدامات کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔

قوموں کی اصلاح اور ملکوں کا استحکام محض باتوں سے نہیں ہوتا شدید محنت اور عزیز سے عزیز چیزوں کی قربانی دیکر سر فروشی کی بدولت ہی لیلائے مقصود سے ہمکناری نصیب ہوتی ہے۔ لہذا تمام وہ لوگ جو زندگی ..... کا کوئی ارفع و اعلیٰ امنگ رکھتے ہیں، اور ایسے لوگ پاکستان کے ہر شہر اور قصبے میں موجود ہیں۔ اپنی بے عملی اور جھجک کو دور کر دیں۔ خود اعتمادی سے کام لیں۔ اور وہ تمام معلوم و معروف تعمیری و اصلاحی کام فوراً شروع کر دیں جن سے قوموں کو وقار اور سربلندی حاصل ہوتی ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جو تاریخ میں اپنا نام نہ چھوڑ سکے۔

(مارچ ۱۹۵۷ء)

وقت کی آواز

بڑے بڑے ناصحانِ مشفق۔ رہبرانِ قوم۔ ماہرانِ سیاست اور دردِ قومی میں سرشار لوگوں کی حصولِ آزادی کے بعد سے کچھ یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ جب تک اقتدار کی کرسی پہ فائز ہیں دن رات کام کریں گے اور جوں ہی اقتدار ختم ہوا ــــــ اُن کی سرگرمیاں بھی سرد ہوئیں۔ نتیجہ میں حضرت قائدِ اعظم اور قائدِ ملّت کے بعد مرحوم یا معزول سابقہ رہنماؤں میں سے الا ماشاء اللہ کوئی ایک رہنما بھی ایسا نہیں ہے جس کی یاد میں قوم اشکبار نظر آتی ہو یا اُس کی کوئی سالانہ یادگار مناتی ہو۔

قومی کارکنوں اور قومی کام کے معیار کی یہ پستی بہت بڑا المیہ ہے، ملک و قوم کی اقتصادی بدحالی تعلیمی پسماندگی اور اخلاقی گراوٹ مسلسل جدوجہد اور لامتناہی ایثار کی متقاضی ہے۔ لیکن مشنری اسپرٹ میں کام کرنے والے سرگرم عمل اور ایثار پیشہ افرادِ ملّت دن بدن مفقود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ذاتی سود و زیاں میں انہماک یوماً فیوماً بڑھ رہا ہے۔ اجتماعیت ختم ہو رہی ہے اور انفرادیت اس کی جگہ لے رہی ہے۔

قومی فلاح و بہبود کی اچھی سے اچھی اسکیم اٹھائی جاتی ہے۔ جلسۂ رسمِ افتتاح کے بعد پھر اُس کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ایک دو دُھن کے پکّے روتے جھینکتے اُس اسکیم سے لپٹے رہتے ہیں تو اُن کو ازکار رفتہ

شئے لطیف نگاری، چندہ خور، سازشی اور خطرناک کے القاب سے نوازا جاتا ہے۔

کاش! اس حقیقت کو فراموش نہ کیا جاتا کہ پاکستان انہیں جیسے قومی دیوانوں کی مدت العمر کی ریاضتوں اور اُن کے جمع کیے ہوئے چندوں سے بنا ہے۔ لیکن آج جبکہ پاکستان ایک دولتِ لازوال کی شکل میں منصۂ شہود پر آگیا ہے تو قومی تحریک۔ قومی کارکنوں اور قومی کام کے لئے چندہ مانگنے والوں کو ذلیل و خوار سمجھنے والے ہی سب سے زیادہ اُس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

پاکستان کا بن جانا ہی ہماری قومی جد وجہد کی آخری منزل نہیں ہے، آزادی کا حصول سہل ہے۔ اُس کو قائم رکھنا دشوار ہے۔ دُنیا کے نقشہ پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ ہمارا ملک کس قدر چھوٹا اور کیسے کیسے خونخوار دشمنوں سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن سب سے بڑا دشمن خود ہمارا انتشارِ ذہنی ہے۔ اب تک کوئی متفقہ قومی نصب العین ہمارے سامنے نہیں ہے۔ آزادی سے پہلے اُس کا حصول ہمارا نصب العین تھا۔ اب صرف ذاتی مفاد نصب العین ہے۔ ایک مضبوط۔ جاندار اور اجتماعی نصب العین پیشِ نظر ہو تو ہر قسم کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہوں۔ چھیاسی فی صدی آبادی کو جہالت کی تاریکی سے نکالا جائے ۷۵ فی صدی مفلس و نادار لوگوں کو ذرائعِ معاش مہیا کئے جائیں۔ لاکھوں خانماں بربادوں کی آبادکاری کی جائے۔ اور نوجوانوں کو اونچے اونچے تعمیری کاموں میں

لگایا جائے۔ فوج اور پولیس کے ذریعہ امن قائم رہنے ہی سے تو کام نہ چلے گا۔ قومی تنظیم، ولولہ۔ کام کرنے کی اُپج اور ہمہ گیر اصلاحِ حال کی اُمنگ کی ہماہمی بھی تو ہونی چاہیئے۔ جو لوگ ان باتوں کو سوچ سکتے ہیں اور ان کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں اُن کو ؎

شب چو عقدِ نماز بر بندم ۔۔۔ چہ خورد بامداد فرزندم

کے چکر سے فرصت نہیں ملتی۔ انسان اور صلاحیت والے انسان کس مپرسی میں پڑے ہوئے ہیں۔ سارے کے سارے اچھے کاموں کا بار اور ہر چیز کی ذمہ داری ارباب اقتدار پر بڑھتی چلی جارہی ہے۔ حکومت کیا کیا کریگی۔ اور کب تک کریگی۔ یہ غیر ملکی امدادیں تابکے۔ جرمنی اور جاپان کا حال ہم سے زیادہ خراب تھا۔ آج یہ ملک نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ ہم جیسے ترقی کی دوڑ میں سست رفتار ملکوں کی اعانت کر رہے ہیں۔ کیا یہ ہماری قومی غیرت کو چیلنج نہیں ہے؟ جب تک ہر ایک فردِ قوم جذبِ قومی و ملکی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی جسمانی اور دماغی صلاحیتوں کو عام فلاح و بہبود کے کاموں میں صَرف نہ کریگا۔ ہماری کشتیٔ مُراد ساحلِ مقصود تک نہ پہونچ سکے گی۔ سائنسی ترقی کے موجودہ دَور میں انسانی تگ و تاز کا میدان لامحدود ہو گیا ہے۔ خود غرضی، تنگ نظری اور قنوطیت کے محدود دائرہ سے نکلنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بقول علامہ اقبالؔ:۔

"قوم کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے اسے ازسرِنو گرم کیا جائے اور تیزی کے ساتھ دوڑایا جائے"۔

(مارچ سنہ ۱۹۶۰ء)

یہ شہزادے!

نئے تعلیمی سال کے لئے اسکول اور کالج کھل چکے ہیں۔ تعلیمی اداروں کو جانے والی تمام سڑکوں اور راستوں میں نونہالانِ قوم کی بھیڑیں کی بھیڑیں آتی اور جاتی نظر آرہی ہیں جنھیں دیکھ کر دل میں اُمنگ اور رُوح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہو، یہی تو وہ عزیز ہیں جو ارضِ پاکستان کے حال و مستقبل کو تابناک بنائیں گے۔ اور انہی کے ہاتھوں ملّتِ اسلامیہ پاکستان اقوامِ عالم کی صف میں سربلندی حاصل کرے گی۔

یہ تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں سب سے بڑا قومی سرمایہ ہیں جن کی فلاح و بہبود اور ہر طرح کی ہمہ وقت دیکھ بھال ہر محبِّ وطن کا اوّلین فرض ہے لیکن اس فرض کی ادائیگی ہم صرف اس طرح کرتے ہیں کہ تعلیم یافتہ اور زیرِ تعلیم نوجوانوں کو دن رات، اُٹھتے بیٹھتے بُرا بھلا کہتے رہیں اور ان کے اخلاق و کردار میں طرح طرح کے کیڑے نکالتے ہیں۔

اس تنقید میں بھی انصاف سے کام نہیں لیا جاتا۔ اور ساری بُرائیاں ہمیں دوسروں کے بچوں ہی میں دِکھائی دیتی ہیں۔ اپنے بچے خواہ وہ کسقدر ہی بگڑ گئے ہوں ان میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ اور اگر احیاناً محلہ پڑوس کا کوئی بزرگ ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلائے تو ہم لڑنے مرنے کو تیار

ہو جاتے ہیں چنانچہ اپنے بچوں کی بیجا حمایت میں ہم آئے دن خون خرابے کر کے جیلخانوں کی آبادی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنے بچوں کی ضرورت سے زائد محبت نہ صرف خود ان کے حق میں سم قاتل ثابت ہوتی ہے بلکہ یہ لاڈلے بڑے ہو کر سب سے پہلے اپنے ماں باپ کو اپنی ستم رانیوں کا شکار بناتے ہیں۔ اس وقت معاشرہ میں عمر رسیدہ لوگوں کا اولاد کے ہاتھوں جو حشر خراب ہوا ہے وہ اسی صورت حال کا نتیجہ ہے۔

ماں باپ بالخصوص ماؤں کو سب سے بڑی فکر یہ رہتی ہے کہ ان کے بچوں کا دل میلا نہ ہو۔ محلہ پڑوس کے ہم عمر بچوں کو وہ جتنی چاہیں گالیاں دیں، ماریں، پیٹیں اور گرد و پیش کے بزرگوں کے سامنے کتنی ہی بدتمیزی اور گستاخی کریں کسی کی مجال نہیں کہ ان کو شفقت آمیز نصیحت بھی کر سکے کیونکہ ان کا بچہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کیوں بری حرکت کرتا۔ لوگ حسد سے الزام لگاتے ہیں اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لڑکوں کا برسر عام مغلظات بکنا۔ دھینگا مشتی کرنا۔ فحش گانے گانا۔ شریف گھرانے کی لڑکیوں پر آوازے کسنا۔ دوسرے کے گھروں میں اینٹ پتھر پھینکنا۔ بجلی کے کھمبوں کو وقت بے وقت زور زور سے پیٹنا۔ بیماروں اور غم نصیب ہمسایوں کی تکلیف کا خیال کئے بغیر پوری آواز پر ریڈیو سننا۔ یہ سب گویا اچھی باتیں ہیں۔ جن کی روک ٹوک کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔

ہمارے ملک میں امریکہ سے آئے ہوئے سستے اور بہ افراط پرانے استعمالی کپڑوں کی بدولت ٹیڈی لباس کی ابتدا ہوئی۔ جس نے کمر اور ٹانگوں

کو تارِ عنکبوت بنا دیا ہے۔ ہم جہان بھر کے ٹیڈیوں پر اعتراض کرتے ہیں خود اپنے گھر کی خبر نہیں لیتے۔ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو اس اعتراض سے بالاتر خیال کرتے ہیں کیونکہ خیر سے وہ شہزادے ہیں۔

بڑے بڑے معلمینِ اخلاق کو بھی (الاّ ما شاء اللہ) ہم نے دیکھا ہے کہ اسلامی بہج اب محض ان کی ذاتِ گرامی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کے دوسرے نوجوان افرادِ خاندان "ایں خانہ تمام آفتاب است" بن چکے ہیں۔ کیوں نہ ہو ٹیڈی معاشرت ترک کرانے میں خسر الدنیا کا جو احتمال ہے۔

خدا کے فضل و کرم سے پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ اس لئے یہاں پوری بلند آہنگی کے ساتھ نہ صرف جملہ مراسم مذہبی منائے جاتے ہیں بلکہ محافلِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مجالس عزا کا بھی خوب شان و شوکت اور دھوم دھام سے انعقاد کیا جاتا ہے جن میں علمائے عظام اپنے پُرجوش و پُرشور مواعظ کے ذریعہ اور تو سب اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں لیکن تعلیم اخلاق، حقوق العباد اور اصلاح معاشرت پر قطعاً زور نہیں دیتے۔ گویا کہ ملت اسلامیہ کو اپنے ہادی برحق صحابۂ کرام اور ائمہ عظام کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے اور یا خدانخواستہ وہ تعلیمات اسلامی سے خارج چیز ہیں۔

اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کرام کی اس خصوص میں بے حسی تو مثالی بن کر رہ گئی ہے۔ ان کو حصول ملازمت والی الٹی سیدھی نصابی تعلیم دینے کے سوا اصلاحِ اخلاق و کردار کے کام سے کوئی واسطہ نہیں۔ نہ خود اعلیٰ اخلاق و روحانیت کا نمونہ بننے کا جذبہ اور نہ اپنے شاگردوں کو اس راہ سے روشناس کرانے کی کوئی حاجت۔

گر ہمیں مکتب وہمیں ملّا　　　کارِ طفلاں تمام خواہد شد

طالب علموں کو اچھی تعلیم و تربیت نہ دینے کا خمیازہ بھی سب سے زیادہ اسی طبقہ کو بھگتنا پڑتا ہے۔ شاگردوں کی نگاہ میں اُستاد کی روایتی عزت ایک عنقا شے ہو چکی ہے۔ اور شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہوگا جو ان کی باقاعدہ ذلت و خواری کی نوبت نہ آجاتی ہو۔

نوجوانوں کی بے راہ روی جس کی تمامتر ذمہ داری۔ والدین بسر پرستوں۔ رہنمایانِ ملت اور اساتذہ کے سر ہے۔ ہمارے ملک کے داخلی مسائل میں ایک انتہائی اہم مسئلہ کی شکل اختیار کر چکی ہے جس پر ہم سب کو فوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ دن دور نہیں کہ ہمارے یہاں بھی امریکہ اور انگلستان کی سی بے عنوانیاں عام ہو جائیں گی۔ سماجی زندگی کی تمام صالح اقدار فنا ہو جائیں گی۔ اور شریف الطبع لوگ مجبور ہو کر شہری آبادیوں سے ترکِ سکونت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور ہاں! یہ جو کروڑوں روپے کے خرچ سے پڑھنے پڑھانے کا کاروبار چل رہا ہے وہ بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

(ستمبر ۱۹۶۵ء)

"چندہ"

چندہ کی مصیبت الاماں والحفیظ! ایسے ایسے عزیز و محترم دوست آنکھیں پھیر لیتے ہیں کہ جیسے ان سے کبھی صاحب سلامت ہی نہ تھی لیکن چندہ کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔ برصغیر پاک و ہند کے محسنِ اعظم سر سید علیہ الرحمۃ چندہ نہ کرتے تو علی گڑھ کی سلطنتِ علمی و تعلیمی کیسے وجود میں آتی؟ یا اگر تحریکِ پاکستان کو کامیابی کی منزل تک پہونچانے کے لئے حضرتِ قائد اعظم چندہ فراہم نہ کرتے تو پاکستان کیسے بنتا اور اس کے صنعت کار و سرمایہ دار کس طرح زندگی پاتے؟

لیکن علی گڑھ اور پاکستان کے فیض یافتہ لوگوں سے ملک و ملت کی موجودہ اور آئندہ فلاح و ترقی کے لئے چندہ مانگا جائے تو ؎

گر جان طلبی مضائقہ نیست
گر زر طلبی سخن درین ست

ایسی ایسی روتی اور بسورتی ہوئی شکلیں سامنے آجاتی ہیں کہ ان پر ترس آنے لگتا ہے۔ یہ لوگ بے پناہ دولت کے مالک ہونے کے باوجود اپنی مالی اور کاروباری مشکلات کا ایسا دردانگیز نقشہ کھینچتے ہیں کہ خود مانگنے والا نادم و شرمسار ہو جاتا ہے۔

بقول مخدومی جناب حاتم علوی، چندہ زیادہ تر کسی لالچ یا دباؤ سے

ملتا ہے۔ سو بیچارے مخلص و ایثار پیشہ قومی کارکن یہ قیمتی ہتھیار کہاں سے لائیں؟

بے لوث طریقے پر اور کارِ خیر سمجھ کر اہلِ بصیرت چندہ دینے والے حضرات سے بھی دُنیا خالی نہیں ہے۔ مگر ان کا پتہ کیسے چلے اور ان تک رسائی کیوں کر ہو؟

چندہ کے باب میں کبھی کبھی تعجب انگیز صورتِ حال سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔ مقصد کی اہمیت اور خصوصی تعلقات کی وجہ سے کسی شخص سے بہت زیادہ توقع ہوتی ہے اور وہ وعدہ وعید کے باوجود خستہ وخوار کر کے مایوس کر دیتا ہے۔ بعض لوگوں کی بابت وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ کچھ دے سکیں گے اور وہ مالی ایثار کے شاندار نمونے پیش کرتے ہیں۔ ایسے ہی اللہ کے برگزیدہ بندوں پر۔

ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کی مثل صادق آتی ہے۔ غالباً اسی بنا پر جناب حسن علی عبدالرحمٰن بیرسٹرایٹ لا کا قول ہے کہ خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو چندہ کے معاملہ میں کبھی ہار نہ ماننی چاہیئے۔

(مارچ ۱۹۷۰ء) ---

"فرد اور ملّت"

مرا کارنامۂ زندگی، مری حسرتوں کے سوا نہیں
یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

---

۳۰ جون ۱۹۷۱ء کو ۷۰-۱۹۷۱ء کا مالی سال ختم ہوا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اپنے سالانہ بجٹ پیش کئے۔ گذشتہ بارہ ۱۲ ماہ کی کارگذاری کا جائزہ لیا۔ کامیابیوں پر فخر کیا۔ اور ناکامیوں کے وجوہ بتائے۔ اس جائزے کی روشنی میں متذکرہ حکومتوں نے سال آئندہ یعنی جولائی ۱۹۷۱ء تا جون ۱۹۷۲ء کے منصوبے پیش کئے جو خوش آیند بھی ہیں اور تشویشناک بھی۔ تشویشناک اس لئے کہ گذشتہ تین سال سے ہمارا ملک قریب قریب تسلسل کے ساتھ آفاتِ ارضی و سماوی اور سیاسی بحرانوں سے گزر رہا ہے۔

قومی: ملکی سطح پر بڑے بڑے حادثات نے تعمیری اور پیداواری صلاحیتوں کو بے طرح مجروح کیا۔

چونکہ ہمارے تمام زرعی صنعتی۔ تجارتی اور عام ترقیاتی منصوبوں کا کافی حد تک دار و مدار غیر ملکی امدادوں اور قرضوں پر ہے۔ اس لئے صورت حال کچھ اس موڑ پر آگئی ہے کہ گویا دوسرے لوگ ہمیں زندہ رہنے کی اجازت دیں تو ہم زندہ رہیں۔ ورنہ موت کی نیند سو جائیں۔

مزید ستم یہ ہے کہ بیرونی امداد اور قرضوں کے ساتھ کچھ اس قسم کی شرط بھی ہوتی ہے کہ صنعتی تنصیبات اور دوسرے منصوبوں میں غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں جو انتہائی گراں ہوتی ہیں۔ بیرونی ماہرین کے شاہانہ اخراجات سے جو روپیہ بچتا ہے اس میں بڑے بڑے مقامی صنعت کار شریک و سہیم ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے اپنے انجینیر اور ٹھیکیدار وغیرہ سبھی تو محب وطن اور فرض شناس نہیں ہوتے اس لئے اصل مقصد پر جائز خرچ کی مقدار بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اور درجہ بدرجہ گوناگوں زیر باریوں سے گزر کر جب پیداوار کی منزل آتی ہے تو اس کا منافع ادائیگیوں کے مطابق نہیں ہو پاتا۔ جس کے نتیجہ میں اگر کوئی چیز برآمد کرنے کی ہوتی ہے تو اس کی قیمت زائد ہونے کے باعث اس کی بیرونی منڈیوں میں خاطر خواہ مانگ نہیں ہوتی اور جو چیزیں ملک کے اندر کام آتی ہیں یا استعمال ہوتی ہیں وہ حد درجہ گراں ہونے کے باعث عوام کی دسترس سے باہر ہو جاتی ہیں۔

عوام کی قوتِ خرید کا گھٹنا اور سرمایہ کا کچھ مخصوص ہاتھوں میں

مجتمع ہو جانا ہماری ناچیز رائے میں ملک پر بیرونی قرضوں کے دباؤ کا اصل راز ہے۔

اگر تمام اہم صنعتوں۔ بنکوں اور انشورنس کمپنیوں وغیرہ کو قومیا کر ان کا انتظام محبِ وطن اور دیانتدار ہاتھوں میں دے دیا جائے! پیداوار کا معیار بلند کیا جائے اور قیمتوں میں کمی کی جائے، تو ہمارا ملک بہت جلد قرضوں سے سبکدوش اور غیر ملکی امدادوں سے بے نیاز ہو جائے گا۔

چین کا نظامِ معیشت ہمارے سامنے ہے، بیس ۲۰ پچیس ۲۵ سال کی قلیل مدت میں کس قدر حیرت انگیز ترقی ہر شعبے میں ہوئی اور اس نے کیسے فخر کے ساتھ اعلان کر دیا کہ اُس پر اب کسی کے قرض کا مطلق بار نہیں ہے۔ چین ایک ایسا ملک ہے جس کی جہالت اور غریبی ماضی قریب میں ضرب المثل تھی اور جس کی آبادی ۷۵ کروڑ ہے، ہر کام میں نیکوکاری۔ صادق القولی۔ دیانتداری اور شدید جسمانی و دماغی محنت کے بغیر کوئی ملک نہ خوش حال ہو سکتا ہے اور نہ حقیقی آزادی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

حل مشکلات کا سارا بار حکومت پر نہ ہونا چاہیئے۔ خود قوم کو بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ اور اپنی خفتہ صلاحیتوں کو بروئے کار

لانا چاہیے۔ ہر ایک فردِ ملت کو چاق چوبند ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف دوسروں کے سہارے زندہ رہنے اور فلاح و بہبود کے جملہ کاموں کی انجام دہی کا بار حکومت پر ڈالنے کی عادت ترک کر دینی چاہیئے۔ رہائش۔ تعلیم۔ حفظانِ صحت اور معاشی خود کفالت ایسے کام ہیں جو امداد باہمی کے ذریعہ حکومت کو زیر بار کئے بغیر بھی انجام دیئے جا سکتے ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص خود غرضی میں مبتلا ہے اور صرف ذاتی مفادات کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ اس سے آگے اجتماعی سطح پر کوئی بات سوچنے یا کرنے کی عادت ہی جاتی رہی ہے۔ اور چونکہ فرد جماعت سے لاکھ علیحدگی اختیار کرے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے پورے معاشرے کی خرابی خود اس کو بھی پنپنے نہیں دیتی۔ ہم لوگ اپنے اور اپنے اہلِ خاندان کے گرد بزعم خود بڑے بڑے مضبوط حصار کھینچتے ہیں۔ لیکن وقت آتا ہے کہ عام تباہی کا سیلاب ان کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

فرد صرف اپنے کو خوشحال بنانے کے لئے جھوٹ۔ دغا۔ فریب رشوت۔ چور بازاری، اسمگلنگ۔ بد دیانتی۔ دھاندلی۔ ظلم و زیادتی۔ مردم آزاری اور ملک فروشی جیسے سنگین جرائم کا دن رات مرتکب ہوتا ہے اور بے حیائی کے ساتھ اس پر فخر بھی کرتا ہے کہ

"کارے کردم"

مگر یہ خوشحالی ذرا بھی تو دیرپا نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے خود اس کی اپنی اولاد بگڑ کر نمک حرامی کی پوری پوری سزا دیدیتی ہے۔ دوسروں کے ہاتھوں بُری دُرگت اس کے ماسوا بنتی ہے۔

ملک خواہ کیسے ہی خطرات سے دوچار ہو اور کتنے ہی نازک دور سے کیوں نہ گذرتا ہو لیکن ہم عبرت حاصل نہیں کرتے؟ چوری ڈکیتی۔ جوا۔ شراب نوشی۔ اغوا۔ خنجر زنی۔ قتل اور قدم قدم پر گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کی وارداتوں کی گرم بازاری بدستور قائم رہتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم نے سوچا کیا ہے؟ یہ تو ناممکن ہے کہ ہر گلی کوچہ میں فوج اور پولس کے سپاہی حفاظت جان و مال کے لئے ہمہ وقت متعین رہیں۔

اپنی ذات۔ خاندان محلہ شہر اور پورے ملک کی حالت بغیر کسی ذہنی تحفظ کے سدھارنے کا کام کسی مخصوص طبقہ یا جماعت تک کیوں محدود رہے؟ ہر صاحبِ شعور شخص کو سہل انگاری چھوڑ کر بڑھ چڑھ کر خود ہی آگے بڑھنا چاہئے۔ اور اُٹھتے بیٹھتے اس کا یہ قول ہونا چاہئے کہ

ع فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
(اقبال)

(جون ۱۹۷۱ء)

تعلیمات

بغداد کی علمی ترقی

یوں تو ابتدائے اسلام سے اور بالخصوص بنی اُمیّہ کے دور سے علمی و تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوگئی تھیں لیکن خاندانِ عباسیہ کے زمانہ میں بغداد ان سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اور اس کی شہرت و دلکشی میں بنو عباس کی علمی سرپرستی نے چار چاند لگادئے۔ بغداد کے علمی ماحول میں آگے چل کر سائنسی علوم کو کافی فروغ حاصل ہوا اور خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں "دارالحکمت" کے قیام سے عقلی علوم کی بخوبی آبیاری ہوئی لیکن ان علوم کے اجراء سے پہلے دوسری صدی ہجری کی ابتدا سے ہی علمی ترقی کی بنیاد پڑ گئی تھی اور عوام میں علوم کی مقبولیت اور تعلیم سے دلچسپی کا یہ حال تھا کہ فارغ التحصیل طلباء کے جلوس بڑی شان و شوکت سے نکالے جاتے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک موقع پر جب ان طلباء پر ان کی کامیابی کی خوشی میں باداموں کی بارش ہو رہی تھی تو ایک مشہور عربی شاعر کی آنکھ پر اس زور سے بادام آکر لگا کہ وہ بصارت سے محروم ہوگیا۔

بنی عباس کے عہد میں جو مختلف حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں بھی فروغ تعلیم اور تعمیرِ مدارس کے لئے بڑی مسابقت جاری رہی لیکن بغداد کی علمی ترقی کا نقطۂ عروج عہد مامون الرشید ہے، اس خلیفہ نے اپنا تمام عہد حکومت جنگ و پیکار اور سلطنت کے انتظام و انصرام میں گذارنے کے ساتھ ہی علوم و فنون کی ترقی کی طرف بھی پوری توجہ کی۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس کے زمانہ میں علوم و فنون کے جس قدر دریا بہے اور اس نے اپنی توجہ خاص سے اس میدان میں جو کارہائے نمایاں

انجام دے اس کی نظیر نہ صرف اسلامی دنیا میں بلکہ اس عہد کی کسی مملکت میں نہیں پائی جاتی ہے۔ مامون الرشید نے اپنے زمانہ میں بیت الحکمت کے تحت ایک دارالترجمہ اور دارالتصنیف قائم کیا تھا۔ جس میں مختلف ملکوں، مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے جاننے والے باکمال لوگ جمع تھے اور دنیا کی بہترین کتابوں کے عربی زبان میں منتقل کرنے کی طرف رغبت ظاہر کرتے ہوئے مامون نے قیصر روم کو لکھا کہ یونانی فلاسفروں کی جتنی تصانیف دستیاب ہوسکیں بغداد بھیجدی جائیں۔ چنانچہ قیصر روم نے پانچ اونٹ ان کتابوں سے لاد کر مامون کے پاس بھجوادیے، اور اس نے یعقوب بن اسحٰق کِندی کو ان کے ترجمے پر مامور کیا۔ اسی طرح اس نے مجوسی علماء کو بیش قرار تنخواہوں پر ملازم رکھ کر مجوسیوں کے علوم و فنون کو عربی میں منتقل کرایا۔ اور ہندوستان سے علم ہیئت، طب اور ریاضی کی کتب اور علمائے ہند کو طلب کرکے عربی زبان میں ان کو منتقل کرایا۔

مامون کے عہد میں ایک مشہور عالم محمد بن موسیٰ خوارزمی نے خلیفہ کی فرمائش پر علم جبر و مقابلہ پر ایک کتاب لکھی جس کے اصولوں میں آج تک نہ ترمیم ہوسکی نہ اضافہ۔ مامون نے بغداد میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی اور اجرام سماوی کے مطالعہ کے لئے علمائے ہیئت مامور کئے، دور دور کے شہروں اور علاقوں سے علماء و فضلا کو وظائف دے کر بلایا جاتا تھا۔ علمی مجالس اور مناظرے منعقد ہوتے تھے جن میں خود خلیفہ شریک ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد میں ہر علم و فن کے باکمال لوگ جمع ہوگئے۔ اور اس عروس البلاد کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی۔ یہاں تعلیمی مراکز، علمی درسگاہیں، رصدگاہیں، طبی سنٹرز اور مساجد جن

ساتھ مدرسے بھی جگہ جگہ قائم ہو گئے۔ اور بغداد ایک عجیب آفاقی دارالعلوم کی شکل اختیار کر گیا۔ اس عہد کے بغداد کی علمی ترقیوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی کہ یہاں صرف روایتی اور قدیم علوم پر ہی توجہ مرکوز نہیں کی گئی تھی بلکہ قرآن وحدیث کے علاوہ یونان وروم کے قدیم فلسفوں، جدید علمی انکشافات اور متفرق علوم طب وہیئت وریاضی وغیرہ کی طرف بھی پوری توجہ دی جاتی تھی۔ ان علوم وفنون کو مسلمانوں نے اس طرح اپنایا کہ وہ انہی کی ایجاد معلوم ہونے لگے۔

خلفائے عباسیہ نے حصول علم اور سرپرستی فنون کے سلسلے میں نہ تو بخل سے کام لیا، نہ عصبیت کو حائل ہونے دیا۔ یہاں تک کہ قدیم فلسفے کے زیر اثر جب مسلمانوں میں آزادیٔ خیال پیدا ہوئی اور فرقۂ معتزلہ کے اثر سے مذہب پر عقلیت پرستی غالب آنے لگی تو اس نئی تحریک کا بزورِ شمشیر سدباب نہیں کیا گیا بلکہ ایسے علمار کا ایک طبقہ وجود میں آیا جنہوں نے عقلی دلائل ہی سے قدیم فلسفیوں اور مخالف قرآن اصولوں کو غلط اور نادرست ثابت کیا۔ یہ علمی فتوحات خلافت عباسیہ کا ہمیشہ طغرائے امتیاز رہیں گی۔ اور ان کے ذریعہ بغداد کو تاریخ میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت حاصل رہے گی۔

خلفائے بنی عباس کے انحطاط اور ان کی مرکزی قوت وسطوت کی کمزوری کے باعث جب آل سلجوق کا اقتدار قائم ہوا تو ماہر فلکیات عمر خیام کے ہم عصر اور ہم مکتب نظام الملک نے بعہد ملک شاہ سلجوقی بغداد میں ایک دارالعلوم نظامیہ قائم کیا۔ اور پرنسپل امام غزالی صاحب "احیاء العلوم"

"کیمیائے سعادت" جیسے متبحر عالم کو مقرر کیا جنھوں نے عرصہ تک دارالعلوم نظامیہ میں رہ کر علوم و فنون کے دریا بہائے بعد ازاں اسی دارالعلوم کے صدر مدرس علامہ ابوالفرج ابن جوزی جیسے امام زمانہ مقرر ہوئے جن کے جلیل القدر تلامذہ میں شیخ سعدی جیسے علمائے روزگار پیدا ہوئے غرض بغداد اپنی علمی شہرت کے باعث ایشیا میں ایک ایسا روشنی کا مینار تھا جس سے ہر طرف علمی شعاعیں نکل کر ایشیا اور یورپ کو منور کر رہی تھیں۔ بغداد کی سیاسی اہمیت زوال پذیر ہونے کے بعد اس کی علمی اہمیت و مرکزیت بھی انحطاط پذیر ہوگئی۔ اور اس کے بعد خلفائے بنی فاطمہ کی سرپرستی میں قاہرہ میں جامعہ ازہر عالم وجود میں آئی۔ دوسری طرف اندلس میں بنی امیہ کے اخلاف نے قرطبہ اور غرناطہ میں علوم و فنون کے دارالعلوم قائم کر کے یورپ کی تاریکی اور ظلمت کو ان علمی مراکز کی روشنی میں منور کیا اور اہل یورپ نے قرطبہ اور غرناطہ ہی سے علمی فیضان حاصل کر کے یورپ کی جہالت کو دور کیا۔ یہی چیز یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور اس کی علمی اور سیاسی ترقی کا موجب اور باعث ہوئی۔ یہ سب مدینۃ العلم بغداد ہی کا فیض ہے جو یورپ آج اقوام عالم میں ممتاز نظر آتا ہے۔

یہ بھی بغداد ہی کے ابتدائی علمی فیضان کا اثر ہے کہ مسلمانوں کی علمی ترقیوں کا مظہر نہ صرف قاہرہ، قرطبہ، غرناطہ بلکہ قسطنطنیہ۔ نیشاپور۔ بلخ۔ بخارا۔ غزنی اور خود برصغیر پاک و ہند میں لاہور۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ ٹھٹھہ۔ ملتان۔ مرشدآباد۔ ڈھاکہ پٹنہ، جونپور۔ اور حیدرآباد دکن وغیرہ میں بے شمار مراکز علمی و تعلیمی مسلمانوں ہی کے طفیل قائم ہو گئے۔ اور یہاں عربی و فارسی اور نیز جملہ علوم اسلامیہ کو اس قدر

ترویج و فروغ حاصل ہوا کہ عربی ممالک کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اس ذہنی اور علمی بیداری کا نتیجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں مختلف سیاسی اور ثقافتی انقلابات کے باوجود مسلمانوں نے نہ صرف اپنی انفرادیت کو قائم رکھا بلکہ اپنی تہذیب و تمدن اور علوم کے فروغ کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین بھی حاصل کر لیا — جس کا نام پاکستان ہے۔ (ستمبر ۱۹۶۵ء)

کراچی میں تعلیم

۱۸۸۴ء میں پورے صوبۂ سندھ بشمول کراچی
....

میں صرف تین مسلمان گریجویٹ تھے۔ مساجد وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے عربی مدارس کے سوا مسلمانوں کا کوئی تعلیمی ادارہ نہ تھا اور بقول جناب حاتم علوی ۱۹۳۵ء تک یہ کیفیت تھی کہ سندھ کے سرکاری و نیم سرکاری اسکولوں میں غیر مسلم لڑکیوں کی تعداد مسلمان لڑکوں سے زائد تھی۔ مسلم طالبات کی تعداد سات اور غیر مسلم طالبات کی تعداد پندرہ ۱۵ ہزار تھی۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور کراچی اس کا دارالحکومت قرار پایا تو لڑکیوں کے ابتدائی تعلیم کے اسکول (۵۵) اور لڑکوں کے (۱۲۱) تھے جن میں علی الترتیب (۴۲۳۹) لڑکیاں اور (۱۲۸۴) لڑکے زیرِ تعلیم تھے۔ اساتذہ کی تعداد پرائمری مدارس زنانہ (۲۰۲) اور پرائمری مدارس مردانہ میں (۵۱۰) تھی۔

۱۹۴۷ء میں ثانوی تعلیم کے اسکول لڑکیوں کے ۹ اور لڑکوں کے ۴۲ تھے جن میں (۱۸۴۷) لڑکیاں اور (۹,۹۹۹) لڑکے زیرِ تعلیم تھے۔ اساتذہ کی تعداد لڑکیوں کے ثانوی اسکولوں میں (۳۶) اور لڑکوں کے ثانوی مدارس میں (۵۰۵) تھی۔

کالج کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۴۷ء میں لڑکیوں کا ایک اور لڑکوں کے

صرف چار کالج تھے ان کالجوں میں علی الترتیب (۱۷۵) لڑکیاں اور (۱۷۹۶) لڑکے زیرِ تعلیم تھے۔

پیشہ ورانہ تعلیم کی سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں یہ صورت تھی کہ ٹیچرس ٹریننگ کا کوئی زنانہ یا مردانہ اسکول یا کالج نہیں تھا۔ ایک میڈیکل کالج تھا جس میں (۱۰۴) لڑکے اور (۷) لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ لا کالج ایک تھا۔ جس میں طلبہ کی تعداد (۱۷۰) تھی ایک انجینئرنگ کالج تھا جس میں ڈگری کے درجات میں (۳۰۸) اور ڈپلوما میں (۱۳۴) لڑکے تھے۔ اسی طرح ایک کامرس کالج تھا۔ جس میں (۱۷۳) لڑکے پڑھتے تھے۔ ہوم اکنامکس کا کوئی کالج نہ تھا۔

سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں ابتدائی تعلیم سے لے کر پیشہ ورانہ تعلیم کے مجموعی اخراجات کی رقم ۶۷،۹۱،۵۵ روپیے تھی۔

اٹھارہ سال بعد سنہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں کراچی میں تعلیمی ترقی کا ذیل کے اعداد سے اندازہ ہوگا۔ لڑکیوں کے ابتدائی تعلیم کے مدارس کی تعداد (۱۹۶) اور لڑکوں کی (۷۷۵) ہوگئی۔ لڑکیوں کی تعداد (۷۴،۳۷) اور لڑکوں کی (۳۷۲،۷۶۱) تک پہونچ گئی۔ ابتدائی تعلیم میں اساتذہ کی تعداد زنانہ ابتدائی مدارس میں (۱۷۴۷) اور لڑکوں کے مدارس میں (۱۱۷۵) ہوگئی ثانوی تعلیم کے اسکول لڑکیوں کے (۹۵) اور لڑکوں کے (۱۵۹) ہوگئے جن میں زیرِ تعلیم طالبات کی تعداد (۲۶،۹۹۶) اور لڑکوں

کی تعداد (۶۲,۶۳۵) تک پہنچ گئی۔ تعداد اساتذہ زنانہ ثانوی مدارس میں (۱,۳۳۹) اور مردانہ ثانوی مدارس میں (۲,۵۱۰) ہوگئی۔

کالجوں کی تعداد ۱۹۶۴-۶۵ء میں (۱۵) زنانہ اور (۲۹) مردانہ تھی جن میں (۷,۳۹۷) طالبات اور (۲۵,۵۱۳) طلباء زیر تعلیم تھے۔

پیشہ ورانہ تعلیم ٹیچرس ٹریننگ کالج میں (۱۰۰) لڑکے اور (۱۹۹) لڑکیاں کالج میں (۸۱۶) لڑکے، قانون میں (۳۰۵) انجینئرنگ میں (۹۲۶) کامرس میں (۷۳۵) اور ہوم اکنامکس میں (۴۶۰) زیر تعلیم تھے۔

پرائمری سے پیشہ ورانہ تعلیم تک مصارف کی مقدار ۱۹۴۷ء میں (۵۵,۹۱,۱۶۷) روپے سے بڑھ کر ۱۹۶۴-۶۵ء میں (۲,۶۲,۴۰,۰۰۰) تک پہنچ گئی۔

ترقی تعلیم کے سلسلہ میں مستحق اور ضرورتمند طلباء اور طالبات کو وظائف دیئے جانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں (۱,۸۶,۴۴۱) روپے۔ ۱۹۶۳ء میں (۳,۱۱,۴۰۹) اور ۱۹۶۴ء میں (۸,۲۹,۰۰۰) روپے کے وظائف دیئے گئے۔

مندرجۂ بالا اعداد و شمار کے پیش نظر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں کا ترقی تعلیم میں کیا تناسب ہے۔

ابتدائی تعلیم ۱۹۶۴-۶۵ء میں سرکاری مدارس مردانہ (۲,۸۰۷) زنانہ (۱۳۵) کل تعداد (۲,۹۴۲) غیر سرکاری ابتدائی اسکول اسی ۱۹۶۴-۶۵ء میں مردانہ (۴۸۸) زنانہ (۶۱) میزان (۵۴۹)

ثانوی اسکول سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں سرکاری (۵۱) زنانہ (۲۸) کُل تعداد (۷۹)، غیر سرکاری ثانوی اسکول سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں مردانہ (۱۰۴) زنانہ (۶۷) میزان (۱۷۱)۔

کالجوں کی تعداد سرکاری مردانہ سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں (۷) زنانہ ایک کل (۸) غیر سرکاری سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں مردانہ کالج (۲۲) زنانہ کالج (۱۴) کل (۳۶)

تعداد اساتذہ پرائمری سرکاری اسکولوں میں مرد و خواتین (۳۱۱۹) غیر سرکاری پرائمری اسکولوں کے ٹیچر مرد و خواتین (۴۳۳۹)

سرکاری ثانوی اسکولوں میں تعداد اساتذہ (۱۴۱۵) اور غیر سرکاری ثانوی اسکولوں میں تعداد (سرکاری کالجوں میں تعداد اساتذہ (۴۰۴) غیر سرکاری کالجوں میں تعداد اساتذہ (۱۴۰۴)

تعداد طلباء و طالبات سرکاری پرائمری اسکولوں میں (۱،۲۵،۶۱۷) غیر سرکاری میں (۱،۴۷،۸۰۳) سرکاری ثانوی مدارس میں تعداد طلباء و طالبات (۳۴،۱۱۷) غیر سرکاری اسکولوں میں تعداد طلباء و طالبات (۵۵،۰۱۴) سرکاری کالجوں میں تعداد طلباء و طالبات (۸،۲۳۶) اور غیر سرکاری کالجوں میں تعداد طلباء و طالبات (۲۲،۶۷۴)

ترقی تعلیم کے مندرجہ بالا اعداد و شمار زیادہ تر نظامت تعلیم کراچی کے شائع کردہ ایک انگریزی پمفلٹ موسومہ "کراچی ایجوکیشن" مطبوعہ سنہ ۱۹۶۵ء سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس پمفلٹ کو مسٹر ایس مسعود افسر شماریات

اور ان کے رفقار کار نے حسبِ ہدایت و نگرانی جناب غلام مصطفیٰ شاہ سابق ناظم تعلیمات انتہائی محنت و کاوش سے تیار کیا ہے۔ پمفلٹ مذکور میں بکثرت گوشوارے اور رنگین نقشے نیز ہر قسم کی تعلیم گاہوں کے بارہ میں وہ مفصل معلومات درج ہیں۔ جن سے تعلیمی میدان میں کام کرنے والوں کی مفید رہنمائی ہوتی ہے۔

بعض اعتبارات سے یہ پمفلٹ تشنۂ تکمیل بھی ہے جس پر ہم آئندہ کسی صحبت میں مفصل روشنی ڈالیں گے۔ تاہم یہ امر مسلّمہ ہے کہ اعداد و شمار کی فراہمی اور ان کا ہر سال پابندیٔ وقت سے شائع ہوتے رہنا ایک بہت ہی ضروری کام ہے، توقع ہے کہ کراچی کے نئے ناظم تعلیمات اپنے پیش رو کے شروع کئے ہوئے اس اہم کام کو مزید ترقی دیں گے اور نہ صرف نظامتِ تعلیم میں شماریات کا بھرپور مستقل شعبہ قائم کریں گے۔ بلکہ ڈسٹرکٹ میں بھی اس کے سیکشنوں کا اجرار فرمائیں گے جن کے ذریعہ صحیح صحیح اعداد جمع ہو کر روشنی میں آتے رہیں گے۔ (جون ۱۹۶۶ء)

پاکستان ایران اور ترکی کا مشترکہ تعلیمی مذاکرہ

۲۰ اور ۲۱ دسمبر ۱۹۶۶ء کو علاقائی تعاون کے ممالک پاکستان۔ ایران اور ترکی کا ایک تعلیمی مذاکرہ کراچی میں منعقد ہوا۔ مرکزی وزیر تعلیم حکومت پاکستان جناب قاضی انوار الحق صاحب نے اس کی رسم افتتاح ایک فاضلانہ تقریر کے ساتھ ادا کی جس میں انھوں نے ہر سہ ممالک پر زور دیا کہ باہمی مفاد کے پیش نظر سائنسی اور فنی ترقی کے میدانوں میں سعی اور تعاون کی کوششوں کے دائرے متعین کیے جائیں، یہ تعین بہت ضروری ہے کیونکہ آجکل کی دنیا میں جبکہ انسان چاند پر کمند ڈالنے کی جستجو کر رہا ہے فنی ترقی سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مذاکرہ اس لئے بہت اہم اور نتیجہ خیز ہے کہ اس کے ذریعے تعلیمی و تہذیبی مسائل فروغ پائیں گے۔ نیز ہمارے باہمی تعلقات کو مزید تقویت پہنچے گی۔ جناب قاضی صاحب نے ابتدائی تعلیم پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کو کم سے کم مدت میں عام کر دیا جائے۔ پاکستان میں اسکولوں کی پنج سالہ ابتدائی تعلیم مفت دی جاتی ہے اور حکومت پاکستان کا منصوبہ ہے کہ آئندہ دس سال کے عرصہ میں ابتدائی تعلیم کو عام کر دیا جائے۔

مذاکرہ میں ایران۔ پاکستان اور ترکی کے مشاہیر تعلیم نے شرکت فرمائی۔ تین مختلف نشستوں میں اہم تعلیمی مسائل پر غور و فکر ہوا۔ سماجی و اقتصادی۔

ترقی میں تعلیم کا کردار اور علاقائی تعاون کے ممالک میں مروجہ نظام ہائے تعلیم بھی زیرِ بحث آئے۔

وزیرِ تعلیم نے یہ بھی فرمایا کہ ادارہ علاقائی تعاون پاکستان۔ ایران اور ترکی کے درمیان ایک برادرانہ اشتراک ہے جس نے تھوڑے سے عرصہ میں ان ممالک میں اقتصادی اور ثقافتی تعلقات مستحکم کرنے کے سلسلہ میں قابلِ تعریف ترقی کی ہے۔ ایرانی وفد کے سربراہ ڈاکٹر منوچہر افضل نے اُمید ظاہر کی کہ یہ مذاکرہ عظیم فوائد کا حامل ثابت ہوگا۔ برادر ملکوں میں جو علمی ترقیاں ہو رہی ہیں ہم ان کے تجربات اور معلومات کا ایک مفید سرمایہ اپنے ساتھ لے کر وطن کو واپس جائیں گے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد ایک کاروباری نشست ہوئی جس کی صدارت پاکستان کے سکریٹری تعلیم مسٹر قدرت اللہ شہاب نے کی۔ شرکا نے اپنے ممالک میں تعلیمی منصوبوں کی پیشرفت کے متعلق معلومات افزا مضامین پڑھے۔

دوسرے روز مجلس مذاکرہ میں R.C.D (علاقائی تعاون) کی یونیورسٹی قائم کرنے کی سفارش کی گئی۔ یہ سفارش پاکستانی وفد کے ایک رکن کی تجویز پر منظور کی گئی۔ ایران اور ترکی کے وفود نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ اور یہ طے پایا کہ یہ تجویز تفصیلی جائزہ کے لیے متعلقہ محکموں کو پیش کر دی جائے۔ مجلس مذاکرہ نے یہ سفارش کی کہ تعلیمی منصوبہ بندی کو اوّلیت دی جائے شرکاء مذاکرہ نے خیال ظاہر کیا کہ چونکہ تعلیم ملک کی ترقی میں بہت اہم کردار انجام دیتی ہے اس لئے اس کی منصوبہ بندی بہت

ضروری ہے مجلس مذاکرہ میں تعلیم عام کرنے پر خاص زور دیا گیا اور تجویز پیش کی گئی کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ تعلیم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے اور ہر سہ ممالک کے لوگوں کی صلاحیتوں کو فنا ہونے سے روکنے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں۔

آخری اجلاس کی صدارت سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ہماری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری جنرل سکریٹری جناب حسن علی عبدالرحمٰن یار ایٹ لا نے فرمائی۔ اُن کی صدارتی تقریر جو دوسری کارروائی کے ساتھ ریڈیو سے نشر ہوئی اس اعتبار سے سُننے کے قابل تھی کہ اس میں عوامی نقطۂ نظر اور مفادات کو بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ مرکزی پبلک سروس کمیشن کے رکن مسٹر فضل الرحمٰن۔ ایران کے ڈاکٹر احمد ریحانی اور ترکی کے وفد کے ایک فاضل رکن نے بھی اپنے اپنے ملک کے نظام ہائے تعلیم پر عالمانہ تقریریں کیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ کراچی کے اخبارات متذکرہ بالا مذاکرہ کی خاطر خواہ تفصیلات شائع نہ کرسکے۔ ریڈیو پاکستان کے "نیوز ریل" پروگرام سے البتہ کافی معلومات حاصل ہو سکیں۔ ضرورت ہے کہ معزز منتظمین مذاکرہ کی جانب سے مفصل روداد جلد از جلد شائع کی جائے کیونکہ ہمارے ملک کا ہر ایک پڑھا لکھا شخص پاکستان، ایران اور ترکی کے

روز افزوں علاقائی تعاون کا نہ صرف پُرجوش حامی ہے بلکہ اس تعاون سے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کا مشتاق رہتا ہے۔ خصوصیت سے تعلیمی اور ثقافتی میدان میں جو موثر اقدامات کیے جارہے ہیں۔ ان سے تو ہم لوگوں کو حد درجہ دلچسپی ہے ان ممالک نیز عرب ممالک سے ہمارا علمی اور ثقافتی رابطہ ابتدائے تاریخ اسلام سے رہا ہے۔ اور ہر سہ ممالک کی تاریخیں اس سے پُر ہیں۔ موجودہ نشاۃ ثانیہ ہر اعتبار سے گوناگوں فوائد کی حامل ہوگی۔

تعلیم کی مشترکہ منصوبہ بندی پر اسلامیت اور مشرقیت کی چھاپ لگے گی جس کے نتیجہ میں ہماری موجودہ اور آئندہ نسلیں مغرب زدگی کی لعنت سے نجات پائیں گی۔ ہماری اپنی ثقافت اور اپنا نظام تعلیم ہوگا۔ جس کے نتیجہ میں اپنی ہی مخصوص فکر و نظر ہوگی جو یقیناً دوسروں کے مقابلہ میں ارفع و اعلیٰ ثابت ہوگی۔ گذشتہ دو صدی کا احساس کمتری احساس برتری میں تبدیل ہوجائے گا۔

مجوزہ مشترکہ یونیورسٹی کے قیام کا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے ہم یہ تجویز پیش کرنے کی جسارت کریں گے کہ اگر اس کا پاکستان میں قائم ہونا قرار پائے تو اسے بلوچستان جیسے تعلیمی اعتبار سے پسماندہ علاقہ کے صدر مقام کوئٹہ میں قائم کیا جائے۔ جو علاقائی تعاون کے ممالک سے قریب تر مقام ہوگا نیز اپنے محل وقوع قدرتی مناظر اور پُرسکون

ماحول کے نقطۂ نظر سے بھی بے مثال ثابت ہوگا۔ کراچی۔ حیدرآباد، لاہور اور پشاور میں یونیورسٹیاں پہلے سے قائم ہیں۔ مغربی پاکستان کا جنوب مغربی علاقہ اب تک نظرانداز ہے۔ اور اس کا مستحق ہے کہ اس کو بھی ایک یونیورسٹی کے قیام سے نوازا جائے۔ بلوچستان میں ایک بڑے مرکزِ علم کے وجود سے اس علاقہ کی معاشی اور اقتصادی پسماندگی بھی انشاء اللہ بہت جلد دُور ہو جائے گی۔[۱] (جون ۱۹۶۶ء)

---

[۱] نہایت مسرت ہے کہ کوئٹہ میں بلوچستان یونیورسٹی قائم ہو گئی اور ہمارے فاضل دوست جناب پروفیسر کرار حسین اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے ہیں۔

اسلام آباد یونیورسٹی

مخدوم و محترم جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب۔ السلام علیکم!

۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۶ھ / ۲۱ جون ۱۹۶۷ء عید میلاد النبیؐ کے مبارک دن، اسلام آباد یونیورسٹی کا جو سنگِ بنیاد رکھا گیا اس کی بے پناہ مسرت ہے۔ پُر خلوص تہنیت قبول فرمائیے۔ ریڈیائی رپورٹ اور اخبارات کے ذریعہ اندازہ ہوا کہ حقیقتاً ایک بہت بڑا منصوبہ جو دور رس فوائد کا حامل ہوگا۔ تیار کیا گیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ اس منصوبہ کو اپنی مخصوص مہارت و قابلیت سے عملی جامہ پہنا سکیں۔

دراصل تحقیقاتی کام کے اس منصوبہ کی آپ کو عرصہ دراز سے قلبی لگن تھی چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۵ء میں ایسی ہی ایک اسکیم عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت آپ کی قیادت میں بروئے کار آئی تھی۔ آپ اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے تھے۔ اور گورنمنٹ نظام نے ابتدائی اخراجات کے لئے دس لاکھ روپے یکمشت اور تین لاکھ روپے سالانہ کی گرانٹ منظور کی تھی۔ اس ادارہ کے لائحہ عمل میں (۱) ریاضیات و اعداد شمار (۲) فلکیات اور نجمی طبیعات (اصل و اطلاقی) (۵) حیاتیات و ارضیات اور (۶) انجینیرنگ میں تحقیقاتی کام شامل تھا۔ ملکی سیاسات میں انقلاب عظیم برپا ہوجانے کے باعث جو کام حیدر آباد میں تشنۂ تکمیل رہا اب وہ انشاء اللہ زیادہ وسیع پیمانہ پر مملکت خداداد پاکستان میں پروان

چمکے گا۔ زیادہ نیاز

مخلص دیرینہ

سیّد الطاف علی بریلوی

جواب

مکرمی سیّد الطاف علی صاحب!

آپ کا کرمنامہ نمبری ۶۷-۶۶/۴/الم مورخہ ۲۴ جون ۱۹۶۷ء موصول ہوا۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ اسلام آباد یونیورسٹی کے سنگِ بنیاد کی تقریب پر آپ نے جس پُرخلوص تہنیت اور جذبۂ خوشنودی کا اظہار کیا ہے۔ میں اس کو آپ کی نوازش اور خیر اندیشی پر محمول کرتا ہوں۔ ساتھ ہی دُعا کرتا ہوں کہ اللہ قادر و توانا مجھے اتنی صلاحیت اور قدرت عطا فرمائے کہ میں اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر آپ جیسے مخلص احباب و بہی خواہوں کی توقعات کو پورا کرسکوں۔

حقیقتاً میں نے ماضی میں تعلیم اور تحقیق کے میدان میں جو کوششیں کی ہیں ان سب کا نقطۂ عروج یہ خدمت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک جتنا اور جو کام ہو چکا ہے اس کی روشنی میں ہمارا ملک اس کیلئے تیار ہے کہ اسلام آباد یونیورسٹی جیسے عظیم منصوبہ کو شروع کرے۔

مجھے یہ معلوم کرکے تعجب آمیز مسرت ہوئی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی اسکیم جو میں نے ہی تیار کی تھی اس کی یاد اب تک آپ کے ذہن میں محفوظ ہے وہ اسکیم بعض وجوہ سے جو ہر شخص کے علم میں نہیں ہیں مکمل نہ ہو سکی اور بھارتی فوجوں نے جب حیدرآباد پر قبضہ کرلیا تو اس سارے منصوبہ کو ہی ختم کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں ہی میں نے وائس چانسلر کے عہدے سے استعفار دے دیا تھا۔ آپ کا مخلص محمد رضی الدین صدیقی (وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی)

تعلیمی اِصلاح ـــــ کیوں؟ اور کیسے؟

پاکستان میں تعلیم کا مسئلہ ابھی تک قومی نقطۂ نظر سے کسی ایسے فیصلہ کن اور انقلاب آفریں منزل تک نہیں پہنچ سکا کہ جہاں ہماری بڑھتی ہوئی قومی ضروریات اور نئے تقاضوں کو پورا کرنے، معاشرہ کو نئے قالب میں ڈھالنے اور اس کو متوازن بنانے میں معاون ہو سکے، ابتدائے قیام پاکستان سے اس مسئلہ پر توجہ کی جا رہی ہے۔ پرانے نظام تعلیم کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی اکثر کوششیں کی گئیں لیکن ابتدائی دس گیارہ برس تک تعلیم کی تعمیر نو کا مسئلہ جہاں تھا وہیں رہا۔ نہ تو ہم پرانے نظام کو اپنی قومی ضروریات کے مطابق اپنا سکے اور نہ کوئی نیا نظام اس کے بجائے ترتیب دے سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو ہم پاکستانی نظریہ کو اپنے نوجوانوں کے دل و دماغ میں راسخ کر سکے اور نہ کسی مفید و تسلی بخش نئے نظام کی داغ بیل ڈال سکے۔ اس غیر یقینی نظام تعلیم پر اپنے نونہالوں کی تربیت کرنے سے ہمیں جو قومی نقصان برداشت کرنا پڑا ہے اور جو شدید مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کا تصور ہی بہت تکلیف دہ ہے۔

تاہم اب کچھ عرصہ سے تعلیم کے اہم مسئلہ پر کسی قدر صحیح خطوط پر توجہ کی گئی ہے مثلاً نظام تعلیم کو عوام کے قومی ولولوں اور رجحانات سے قریب تر لانے کے لئے دینی تعلیم کا انتظام، سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کا اعتراف اور اس کی ترویج، عوامی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش۔ طلبار کی صحت کا

خاص اہتمام، مساجد اور خانقاہوں میں مدارس و مکاتب قائم کرنے کی کوشش اور سب سے زیادہ اہم اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا، یہ سب باتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ہمارے تعلیمی مقاصد کے بنیادی اصولوں کو پروان چڑھنے کا موقع دیا جا رہا ہے جس کے مفید نتائج انشاء اللہ مستقبل قریب میں منظرِ عام پر آجائیں گے۔

چونکہ ہمارا ملک عظیم الشان ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کا بھی بارِ گراں سنبھالے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے اس لیے اس کے ذرائع اور وسائل اتنے نہیں کہ ہم ان کو بے مقصد نظامِ تعلیم پر ضائع کریں۔ نہ یہ مناسب ہے کہ ان وسائل کو جو بہر حال محدود ہیں غیر مفید اور بیکار افرادی طاقت پر صرف کریں۔

ہمیں اپنے عوام کو صرف تعلیم ہی نہیں دینی ہے بلکہ انھیں جدید زندگی کے تقاضوں کی بھی تربیت دینا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم اپنی ملت کو ترقی یافتہ قوموں کی صف میں نہ کھڑا کر سکیں گے۔ ہمارے مستقبل کی ضروریات اور ہمارا نظامِ تعلیم دونوں ایک دوسرے سے قطعی غیر مربوط ہیں۔ اس نظامِ تعلیم کے تحت ایسے شعبوں کے لیے افرادی قوت کی شدید کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نظامِ تعلیم کو بامقصد اور مفید بنایا جائے تاکہ افرادی قوت سے متعلق ملک کی ضروریات پوری ہو سکیں اور فرد کے لیے مسرت اور کامیابیوں کا موجب بنے۔

نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جو ایک طرف ملک اور دوسری طرف فرد کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ ہمارے ماہرین تعلیم، دانشوروں اور سیاسی مبصروں کا فرض ہے کہ تعلیمی نظام اور سماجی تشکیل نو کے لیئے ایک مربوط لائحہ عمل تجویز کرے اس پر کاربند ہونے کے لیئے جہد عظیم اور سعیٔ بلیغ کریں۔

ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں سائنس نیز فنی و حرفتی تعلیم پر کافی توجہ کی گئی ہے شعبہ کامرس کے لیئے بھی کافی گنجائش نکل آئی ہے ہمارے طلباء کا عام رجحان اور ذوق و شوق بھی ان کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن پریشانی یہ ہے کہ فنی اور سائنسی تعلیم کے ادارے بہت ناکافی ہیں اور ان میں داخلہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اور اگر کسی نہ کسی طرح داخلہ مل جائے تو فیس داخلہ ماہوار اور دیگر مصارف اس قدر زیادہ ہیں کہ خوشحال لوگ ہی ان کو برداشت کر سکتے ہیں۔

میڈیسن یا طبی شعبہ کی طرف ہمارے طلباء اور طالبات خاص طور پر متوجہ ہوتے ہیں لیکن صرف محدود تعداد وہاں داخل ہونے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہ طالب علم ملک کے ہر میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہر جگہ مایوس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی حال انجینیرنگ کی مختلف شاخوں کا ہے ان کے لیئے آسانیاں اور بھی کم ہیں۔ ہمارے ملک

کو اس وقت انجینیری کی تعلیم کے ہر شعبہ میں کافی افراد کی ضرورت ہے اور نئے منصوبوں کے تحت جو بھاری صنعتیں قائم کی جائیں گی اس وقت تو اور بھی زیادہ ضرورت ہوگی۔ پیٹرولیم۔ دیگر معدنیات، بحری تنصیبات، جہاز رانی اور فضائی ضروریات کے لئے بکثرت ماہرین درکار ہیں۔ ان کے علاوہ معمولی ماہرین ٹیکنالوجی کی کھیپ کی کھیپ تیار کرنے کی ضرورت ہے جو بھاری صنعت کے کارخانوں میں کام کر سکیں۔ اسی طرح بیشمار ڈاکٹروں کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی تک شہروں کی بھی طبی ضروریات پوری نہیں ہوئی ہیں، قصبوں اور گاؤں کا تو ذکر ہی کیا ہے، ان کے لئے بھی بہت سے ڈاکٹر چاہئیں۔ انگریزوں کے زمانہ میں۔ ایم۔ بی۔ ایس کی تعلیم کے علاوہ ایک اور اس سے کم درجہ کی تعلیم کا امتحان ہوتا تھا جس کو "ایل۔ ایم۔ پی" کہا جاتا تھا۔ اس میں میٹرک پاس طلبار داخل کئے جاتے تھے۔ تین سال کا کورس تھا۔ یہاں سے کامیاب ہو کر جو ڈاکٹر نکلتے تھے ان کو قصبات و دیہات کی ڈسپنسریوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اگر یہ سلسلہ پھر سے جاری کر دیا جائے تو ہماری بہت سی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اس وقت بھی پاکستان سے ہر سال چھ سو ڈاکٹر بیرونی ممالک میں جا کر ملازمت تلاش کرتے ہیں جو سخت حیرت انگیز ہے۔ آخر پاکستان کے یہ ہونہار فرزند اپنے وطن اور عزیز و اقربا کو چھوڑ کر دور دراز اجنبی مقامات پر کیوں جاتے ہیں؟ اس کی وجوہات عام طور پر واضح ہیں جن کو ہم یہاں تفصیل سے بیان کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ ہمارا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ ان اسباب

کو جلد از جلد دور کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹروں کی شکایات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے اور ایسی کوشش کی جائے کہ ہمارے معاشرہ کے یہ مفید افراد خواہ وہ ڈاکٹر ہوں، انجینیر ہوں یا ٹیکنیشین ان کو صرف محدود تعداد میں حکومت کی اجازت سے باہر جاکر اپنے وطن کی عزت و شہرت اور اہل وطن کی صلاحیت کو دو بالا کرنے کا موقع دیا جائے اور باقی لوگوں کے لیئے ایسی سہولتیں بہم پہنچا دی جائیں، کہ وہ اسی ملک میں رہ کر اور ابنائے وطن کی خدمت کرکے اپنے جذباتِ حب الوطنی کی تسکین کر سکیں۔

ہمارے ملک نے صنعت و حرفت کے میدان میں جو عظیم الشان ترقی کی ہے اس کی شہرت پاکستان سے باہر ترقی یافتہ ملکوں میں بھی پہونچی ہے اور ان سے داد و تحسین وصول کر رہی ہے۔ صنعتی ترقی کے ساتھ جو اقتصادی، سماجی اور معاشی مسائل ابھرتے ہیں ان سے ہر ایک ملک کو سابقہ پڑتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انگلستان میں اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب سے لے کر آج تک جو زبردست سیاسی بحران پیدا ہوئے ہیں ان سب میں صنعتی عوامل کار فرما رہے ہیں۔ انگلستان کے جمہوری نظام اور اس کی لچک نے ان مشکلات سے عہدہ بر آئی حاصل کی اور ایسے حالات کو پیش نہیں آنے دیا جو یورپ کے دوسرے ممالک میں شدید سیاسی انقلابات کی شکل میں رونما ہوئے لیکن بایں ہمہ صنعتی ترقی سے پیدا ہونے والے مسائل آج بھی ہر ملک کو وقتاً فوقتاً سخت مشکلات سے دوچار کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں صنعت کاری کا فروغ حیرت انگیز طور پر ہوا ہے۔ مسائل بھی اسی رفتار سے رونما ہوئے ہے

ہیں۔ بعض مسائل کا حل ڈھونڈ لیا جاتا ہے اور مشکلات پر قابو پا لیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں قانون سازی کے ذریعہ بعض اہم اقدامات کئے جا چکے ہیں اور کچھ زیرِ غور بھی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ تمام مسائل خوش اسلوبی سے حل ہو جائیں گے۔

آخر میں ہم ایک اور اہم مسئلہ پر بھی کچھ اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے معاشرے کی تعلیمی و اقتصادی حالت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارے صنعت کاروں کو اپنے کاروبار کی تنظیم کرنے اور اس کو فروغ دینے کے لئے فنی ماہرین کی خدمات کی ضرورت ہوتی ہے جن کو وہ اپنے کارخانوں میں مقرر کرتے ہیں۔ یہ سب اپنے فن میں ماہر اور بڑی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان کی تمام ماہرانہ قابلیت اور فنی مہارت بعض ایسے صنعت کاروں کے ہاتھ بک جاتی ہے جو خود فن زر کشی کے سوا کسی اور فن کے ماہر نہیں ہوتے اور نہ قابل سے قابل اور کارگذار سے کارگذار شخص کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی خاطر نہ صرف کم سے کم تنخواہ دیتے ہیں بلکہ اس کو اپنا ذاتی ملازم سمجھ کر اس سے غیر منصفانہ سلوک کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اس کو سرکاری افسران کے مقابلہ میں زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ملازمت کا کوئی تحفظ نہیں ہوتا۔ اور تنخواہ میں خسارہ رہتا ہے، حکومت کو چاہیئے کہ پرائیوٹ سیکٹر میں ہر درجہ کی ملازمتوں کے لئے جتنے ملازم کارخانوں اور فیکٹریوں کے انتظامی و فنی شعبوں میں کام کرتے ہیں، ان کی تعداد اور مشاہروں پر دسترس رکھے۔ اور ملازمتوں کا تحفظ دلائے۔ ان کی تنخواہ کا معیار ان کی ذاتی قابلیت و مہارت پر ہو نہ کہ ان کے آقاؤں کی صوابدید پر۔ ان تدابیر

سے فارغ التحصیل ماہرین کا ملک سے باہر جانا بند ہو جائے گا نیز تعلیم یافتہ لوگوں میں جو بیکاری پھیلی ہوئی ہے اور حکومت کیلئے مستقل دردِ سر بن گئی ہے اس کا کچھ مداوا ہو سکے گا۔ کام بھی زیادہ خوش اسلوبی سے انجام پائے گا اور ملک کی صنعتی ترقی و خوشحالی میں بیش از بیش اضافہ ہو گا۔

تعلیم اور افرادِ ملت کی مالی اعتبار سے بے فکری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ معاشی بدحالی ترقی کی تمام راہوں کو مسدود کر دیتی ہے اور بالخصوص تعلیمی اصلاح کے تمام منصوبے صرف اسی ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

توقع ہے کہ ہمارے بیدار مغز اور دُور بین سربراہانِ مملکت ہمارے ان ناچیز تاثرات پر توجہ فرما کر تعلیمی اصلاح سے متعلق اپنی مخلصانہ تجاویز کو زیادہ سے زیادہ موثر بنائیں گے۔

دسمبر ۱۹۶۸ء

طالب علموں کا مسئلہ
ایک تاریخی پس منظر

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن
آخر اس بزم میں کوئی تو سخندان ہوگا

۲۷؍ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو حکومت وقت کا جشن عشرہ ترقیات تزک و احتشام سے منایا گیا جس میں ہر طبقہ اور خیال کے لوگوں نے پُرجوش عملی حصہ لیا خصوصاً تمام تعلیمی اداروں میں تو دو ماہ قبل سے جشن مذکور کے نہایت تفصیلی رنگا رنگ پروگرام چل رہے تھے۔ اس وقت کسی کو یہ خیال و گمان بھی نہ تھا کہ تھوڑے عرصہ بعد ہی ملک کی فضا اچانک تبدیل ہو جائے گی۔ تاریخ و سیاست کے طالب علموں کے لئے اس طرح کی تبدیلیوں کا اچانک رونما ہونا کوئی نئی بات بھی نہیں ہے، لیکن یہ مسئلہ کا سیاسی پہلو ہے اور ہم ایک تعلیمی ادارہ سے متعلق ہونے کے باعث سیاست کے خارزار میں الجھنا نہیں چاہتے۔ تعلیم اور طلباء کی حد تک ہی اپنے چند خیالات پیش کرنے

پر اکتفا کریں گے ــــــ تعلیمی موضوع کے بھی دو پہلو ہیں اور افسوس ہے کہ اپنی مجبوریوں کے باعث ہمیں ان کے کماحقہٗ اظہار کا بھی یارا نہیں ع

عجب دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
دگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

فی زمانہ ساری دنیا کے طالب علم اپنے اپنے ملک کی سیاست میں کھُل کر حصہ لے رہے ہیں اور اپنی اپنی فائز الوقت حکومتوں کے واسطے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ حکمرانوں نے زور اور قوت سے ان کو دبانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وجہ یہ کہ ان کا نوجوان خون ہے۔ مادی سود و زیان کا احساس ان کی راہ میں حائل نہیں۔ ہر قسم کے نسلی، لسانی اور مذہبی تعصبات سے ان کو واسطہ نہیں۔ ایک خاص قسم کا بھائی چارہ اور میل ملاپ ہے سب سے زیادہ یہ کہ معاشرہ میں ماشاءاللہ ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی گنتی، شمار ناممکن ہے۔ کسی ایک متاثر کرنے والے واقعہ یا موثر آواز پر ان کی فوج ظفر موج ٹڈی دل کی طرح میدان میں نکل آتی ہے جس کو سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح قابو میں رکھنا قریب قریب ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

طلباء کے والدین، اساتذہ اور ہماری طرح دوسرے تمام ہمدرد اُن کو عملی سیاست سے علیحدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش ہمیشہ کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں مگر تجربہ نے ثابت کیا کہ یہ کوشش وقتی طور پر تو

کچھ کامیاب ہو جاتی ہے لیکن اس کو دوام حاصل نہیں ہو پاتا۔

تمام دنیا کے طلبار کی ہمہ گیر تحریک۔ اس کے وجوہ و اسباب۔ اور عہد بعہد ارتقار پر روشنی ڈالنے یا بہت زیادہ پرانی تاریخ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اسی بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند کے سب سے بڑے تعلیمی مرکز علی گڑھ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ طلبار اپنے دار العلوم کے داخلی مسائل یا ملکی و بین الاقوامی سیاست سے علیحدہ رہے ہوں۔ سرسیّد علیہ الرحمتہ اور ان کے تمام جانشینوں کو طلبار کی شکایات - مطالبات اور ان میں وقتاً فوقتاً بے چینی کی جو لہریں اٹھتی رہیں ان سے واسطہ پڑتا رہا۔ اگر انھوں نے ٹھنڈے دل و دماغ اور ہمدردی و حسنِ تدبیر سے کام لیا تو وہ طلبار کے محسن و مرشد قرار پائے اور اس کے برعکس طرزِ عمل اختیار کیا تو نہ صرف انجام کار ناکامی و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا بلکہ بعض مواقع پر ادارہ کی سربراہی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

علی گڑھ میں کافی عرصہ تک انگریز پرنسپل اور اساتذہ سیاہ و سپید کے مالک بنے رہے۔ قومی نقطۂ نظر سے جب ان کا طرزِ عمل ناقابلِ برداشت ہو گیا تو ۱۹۰۷ء کا مشہور اسٹرائک ہوا اور انھیں خدمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ سرسیّد کے جانشین ارشد نواب محسن الملک کے آخری ایامِ حیات میں ہندی اُردو کے پرانے قضیے نے از سرِ نو زور پکڑا۔ نواب صاحب نے حکومت سے ٹکر لی۔ طلبار نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اسی قضیے نے دو قومی نظریے اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریقۂ انتخاب کے مطالبہ کو پختہ کیا۔ مسلم لیگ کا

قیام عمل میں آیا اور طلباء نیز دوسرے فدائیانِ قوم کی ایک ترقی پسند جماعت مسلمانوں میں پیدا ہو گئی۔ نواب وقار الملک کی جرأتِ ایمانی اور حریتِ فکر نے تحریک کو ایک منظم شکل دی اور معاملاتِ قومی میں علی گڑھ کی قیادت مسلم ہو گئی۔

۱۹۱۱ء میں انگریز حکمرانوں کی شہ سے طرابلس پر اٹلی نے حملہ کیا اور کچھ عرصہ بعد ہی جنگ بلقان چھڑ گئی۔ مسلمانوں کی محبوب سلطنتِ ترکی کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اِن بیرونی حوادث اور انہدامِ مسجد کانپور کے مقامی سانحہ کی وجہ سے مسلمانانِ ہند حد درجہ مضطرب ہوئے اور ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں طلبائے علی گڑھ کا ایک طبی وفد قسطنطنیہ گیا جس کے ایک رکن ہمارے بزرگ جناب چودھری خلیق الزماں صاحب بھی تھے۔ پھر ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اور چونکہ برصغیر کے حکمراں، انگریزوں کے خلاف سلطنتِ اسلامیہ کی نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا اس لئے مسلمانانِ ہند ایک دن چین سے نہ بیٹھے تا آنکہ اس بے چینی کے ڈانڈے جلیان والا باغ امرتسر کے خونی ڈرامہ اور تحریکِ خلافت و ترکِ موالات سے جا ملے جس میں خصوصیت سے مسلم نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نوجوانوں کا جوشِ عمل بیدار کرنے میں مولانا محمد علی کے اخبارات 'ہمدرد' و 'کامریڈ' نے اور مولانا ظفر علی خاں کے 'زمیندار' نے نمایاں حصہ لیا۔ اس وقت جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ مسلم یونیورسٹی تک

کو ایک آزاد تعلیمی ادارہ بنانے کی زبردست جدوجہد کی گئی جو اگرچہ کامیاب نہ ہوئی لیکن اس کی جگہ جامعہ ملیہ اسلامیہ معرض وجود میں آگئی۔

برّصغیر کی ہندو اکثریت نے آزادیٔ ہند کی شاندار متحدہ تحریک کو اپنی تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی سے 'شدھی سنگھٹن' کی ہڑبونگ میں پھنسا دیا۔ تو مسلمانوں نے "تبلیغ" و "تنظیم" کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ نوجوان طبقہ اس میں بھی پیش پیش رہا۔ ۱۹۲۷ء کی 'نہرو رپورٹ'، میں مسلمانوں کی حق تلفی، محمد علی جناح کے جوابی چودہ نکات، ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کو نظر انداز کر کے قومی تحریک کو ملک گیر سول نافرمانی کے ذریعہ چلانا۔ لندن میں مصالحت کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنسیں۔ اور ان کی ناکامی، ۱۹۳۵ء کے 'دستور' کا نفاذ ــــ صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کا قیام۔ مسلمانوں پر بے پناہ مظالم۔ قائداعظم کی قیادت میں ۱۹۳۷ء سے مسلم لیگ کی تنظیم نو اور ۱۹۴۰ء سے مطالبۂ پاکستان ــــ آٹھ سال تک مسلسل اور شب و روز ملک کے طول و عرض میں حصولِ پاکستان کی پُرجوش تحریک چلی جس میں عمر رسیدہ مردوں اور خواتین کے ماسوا نوجوانوں نے بھرپور حصہ لیا۔

مسلم لیگ کے دوش بدوش کام کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن' کی تاسیس ہوئی۔ ہندو نوجوانوں کی

"آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن" پہلے سے موجود تھی۔

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سکریٹری جنرل مسٹر محمد نعمان زبیری اور صدر راجہ صاحب آف محمود آباد تھے۔ مسٹر مشیر حسین قدوائی، چودھری اختر حسین لکھنوی ایڈوکیٹ۔ شیر بنگال مولوی فضل الحق اور عزیز ملت مسٹر عبد العزیز بیرسٹر پٹنہ جیسے اکابر نے اس کی سرپرستی کی۔ مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے بھی فیڈریشن میں بڑے جوش اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ پانچ سال کے اندر سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود فیڈریشن کی تحریک نے مستقل صورت اختیار کر لی، تقریباً تمام صوبوں میں شاخیں قائم ہو گئیں اور جب مطالبۂ پاکستان اپنے پورے شباب پر تھا تو دہلی کو اس کا مرکز قرار دیا گیا۔

"مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی" شاخ پنجاب نے بڑے وسیع پیمانے پر ایک مخصوص پاکستانی کانفرنس منعقد کی جس میں بکثرت زعمائے مسلم لیگ شریک ہوئے اور اجلاس کی صدارت قائد اعظم نے کی جنھوں نے اس موقعہ پر اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرمانے سے قبل طلباء کو دعوت دی کہ پہلے وہ اپنے رزولیوشن پیش کر کے آزادانہ بحث کے ساتھ فیصلے کریں۔ چنانچہ انھوں نے "قرارداد لاہور" کی تائید کی اور دوسرے رزولیوشن کے ذریعہ طے کیا کہ طلبار کا ایک وفد مسلم عوام کو قرارداد پاکستان کے بنیادی اصولوں سے آگاہ کرنے کے لئے دورہ کرے۔

اس کانفرنس کے بعد سے حضرت قائد اعظم نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ

ایک مخصوص دن طلباء سے ملاقات کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور ہر قسم کے ملی و ملکی مسائل پر اُن سے تبادلۂ خیالات کر کے ان کی تشفی کرتے تھے۔ قائدِ اعظم کو طلبا کی بے لوث فہم و فکر اور صالح کردار و عمل پر بدرجۂ اتم اعتماد تھا۔ کس قدر ہی مصروف اور پریشانیوں میں گھرے ہوئے کیوں نہ ہوں طلباء سے ملاقات کا وقت ضرور نکال لیتے تھے۔ علی گڑھ کو تو وہ اپنا "اسلحہ خانہ" کہا کرتے تھے۔

تحریکِ آزادی اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد کو بامِ عروج پر پہنچانے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے میں نوجوان مسلم طلبائے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ ۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی، صوبۂ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے لئے استصوابِ رائے، قیامِ پاکستان کے بعد صوبۂ سرحد اور سلہٹ کو پاکستان میں شامل کرنے کی رائے شماری میں طلباء نے عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ بڑا کمال یہ تھا کہ اس کُل ہنگامی دور میں ڈسپلن بھی اس قدر قائم رہا کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں برابر کھلی رہیں۔ اور تعلیم کا قطعی حرج نہ ہوا۔ مزید یہ کہ طلبا نے سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی عمارات یا پبلک املاک کو بھی کبھی کوئی نقصان نہ پہنچایا۔

متذکرۂ بالا زریں خدمات کے اعتراف میں حضرت قائدِ اعظم اور قائدِ ملت لیاقت علی خاں جب تک پاکستان کے سربراہ حکومت رہے۔ طلباء کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں طلباء کو کوئی شکایت

ہی نہ ہوئی اور نہ کسی قسم کا ایجی ٹیشن ہوا۔ ان محسنینِ قوم کے ادنیٰ اشارے پر مشرقی و مغربی پاکستان کے لاکھوں طلباء ہمہ وقت اپنی جان کی بازی لگانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اور کسی بھی بڑے سے بڑے مخالف کی مجال نہ تھی کہ اُن کی موجودگی میں ان کے قائدین کے خلاف ایک حرف زبان سے نکال سکے۔ نہ صرف ان کی زندگی میں بلکہ اُن کے مرنے کے بعد آج تک پاکستان کے کسی نوجوان نے اپنے کسی قول و فعل سے ان پُر عظمت منارہ ہائے نور پر گرد و غبار نہ جمنے دیا۔

* * *

۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو خان لیاقت علی خاں کی المناک شہادت ہوئی۔ اور اس حادثۂ عظیم کے بعد ہی سے شک و تشکیک کا دور شروع ہو گیا۔ کل تک جو قوم کے سپاہی تھے مغضوب ہو کر مجرم قرار پائے۔ ۸ر جنوری ۱۹۵۳ء کو عروس البلاد کراچی میں طلبہ کو گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ہمارے جمہوری دور کے وہ رہنما جو کبھی دوائے دردِ دل بیچتے تھے، انہوں نے اپنی دوکان ایسی بڑھائی کہ اس نے کھلنے کا نام ہی نہ لیا۔ مجھ ناچیز کا یہ ایقان ہے کہ اگر ہمارے سابق سیاست داں حضرات اپنے عہدِ اقتدار میں طلباء کی جماعت کو اپنے اعتماد میں رکھتے۔ دل آزاری کے بجائے اُن کی دل داری کرتے۔ ان کی جائز شکایات و تکالیف کو محبت و اخلاص کے ساتھ دور کرتے۔ اپنا دشمن اور فریق مخالف سمجھنے کے بجائے انہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تو ملک آزاد ہو جانے

کے باعث ہمارے طلباء کا رول ہی کچھ اور ہوتا —— ان کا مزاج جذباتی ہونے کے بجائے علمی اور خالص تعمیری ہوتا۔

بہرحال! اکتوبر ۱۹۵۸ء میں انقلاب آیا اور بڑی دھوم دھام سے آیا، پورے ملک نے بشمول نوجوان طلباء اس کا خیر مقدم کیا اور بانیٔ انقلاب کو اپنا نجات دہندہ قرار دیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جس کو کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

—— ⁂ ——

جیسا کہ ہر حکومت کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے اصلاحی منصوبوں میں سب سے پہلے عوام کی تعلیم پر توجہ کرتی ہے اور پرانے نظام کو نئے طریقے سے ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے بھی مارشل لا جاری ہونے کے دو دن بعد اپنی پہلی اخباری کانفرنس میں جن تین کاموں کا ذکر کیا اور جن کو جلد سے جلد عمل میں لانا ضروری قرار دیا۔ ان میں تعلیمی اصلاح کا کام بھی شامل تھا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو "قومی تعلیمی کمیشن" کا تقرر ہوا اور اسے فوراً کام کرنے کی تاکید کی گئی۔ اس سلسلہ میں صدر نے فرمایا۔

> "ہماری سب سے اہم ضرورت ایسے اعلیٰ تربیت یافتہ اور نظم و ضبط میں پختہ مردوں اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کرنا ہے، جو رہنمائی اور ہدایت کا فرض ادا کر سکیں۔
> میرے خیال میں ہمارے قومی تقاضوں میں سب سے اہم تقاضہ

یہی (ہے)۔ زمین۔ کھیتی باڑی۔ قانون اور انتظام کے بارے میں جس قدر اصلاحات بھی نافذ کی جارہی ہیں اور سیاسی آئینی۔ سماجی اور اقتصادی استحکام اور فلاح وبہبود کے لئے جو کوششیں بھی ہورہی ہیں ان سب کا مقصد ایک ہی ہے۔ یعنی ایسے حالات پیدا کرنا جو صحیح قسم کے مرد وزن کی نشوونما کے لئے ضروری ہوں۔ ہماری تمام کوششوں کا مقصود ہمارے نونہال ہیں جو آج اسکول یا کالجوں میں تعلیم پارہے ہیں۔ مگر کل جن کا فرض ہوگا کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں ملک کی قیادت کو سنبھالیں“

(فرینڈز ناٹ ماسٹرس صفحہ ۱۶۲۔ اردو ترجمہ)

لیکن آٹھ ماہ بعد ۲۶ر اگست ۱۹۵۹ء کو تعلیمی کمیشن کی جو رپورٹ پیش کی گئی وہ بدقسمتی سے اس طرح کی تھی کہ اس نے عہد انگریزی کے نظام تعلیم کی خرابیوں کی تو نشاندہی کی لیکن جو متبادل اصلاحات تجویز کیں ان میں سے بیشتر تعلیم پانے والوں اور تعلیم دینے والوں دونوں کے لئے ناقابل عمل تھیں۔ اس رپورٹ کے سارے کرتا دھرتا زیادہ تر وہ حضرات تھے جو برطانوی راج میں افسر تعلیم رہے تھے! اور ایوب خانوں کے آٹھ سالہ عہد میں جو تعلیمی پالیسی رہی تھی۔ اس میں خوب رچے بسے ہوئے تھے۔ بار بار کہی ہوئی باتوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں، خلاصہ صرف یہ ہے کہ تعلیم کو معیاری بنانے کے لئے تعلیمی ترقی میں گوناگوں

رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور جب ان رکاوٹوں کے خلاف زبردست احتجاج ہوا تو نوجوانوں کے جسم و دماغ سے گویا "شرارت" نکالنا فرض اوّلین ہو گیا۔ ہر سطح پر تعلیمی اداروں اور طلباء کی جماعتوں نے احتجاجی جلسے کئے اور جلوس نکالے۔ جس کے نتیجہ میں ان پر لاٹھی چارج ہوا۔ اشک آور گیس پھینکی گئی اور بکثرت طالب علم گرفتار کئے گئے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں نافذ شدہ "یونیورسٹی آرڈی ننس" نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ طلباء کی جانب سے جس طرح کا احتجاج نومبر سنہ ۱۹۶۸ء سے ہوا کم و بیش ویسا ہی اواخر سنہ ۱۹۶۴ء تک ہوتا رہا۔ مثلاً صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اپنی خود نوشت سوانح میں تحریر فرمایا ہے کہ سنہ ۱۹۶۳ء کے سارے سال میں ڈھاکہ یونیورسٹی نے صرف ستائیس دن کام کیا۔"

(صفحہ ۱۶۶۔ ترجمہ)

اس زمانہ کے کچھ اخباری تراشے ہمارے پاس موجود ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے روزنامہ جنگ کراچی نے ۱/۲ دسمبر سنہ ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں اپنے اسٹاف رپورٹر کے حوالہ سے ۳۰ ر نومبر کی ایک خبر کی یہ سرخیاں دیں:۔

"کراچی کے طلباء نے آج سے عام ہڑتال کرنے کا اعلان کر دیا"

"ہڑتال غیر معینہ مدت کے لئے ہو گی۔ آج ڈی۔ جے کالج میں طلبہ کا جلسہ ہو گا۔"

جس وقت طلباء کا یہ ایجی ٹیشن اور اس کے خلاف داروگیر چل رہی تھی راقم نے ایک اخباری بیان جاری کیا جو ۱۱ر اور ۱۲ر دسمبر ۱۹۶۴ء کے قریب قریب تمام اخبارات میں شائع ہوا۔ اس بیان میں حکومت سے طلباء کو اپنے اعتماد میں لینے کی درخواست کرنے کے ساتھ ہی ساتھ یہ تجویز بھی پیش کی کہ مغربی پاکستان کی چاروں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں اور صوبائی محکمۂ تعلیم کے سکریٹری مسٹر منظور الٰہی پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے جو طلبہ کے مطالبات اور یونیورسٹی آرڈی ننس کے معاملہ پر غور کرے۔ دو روز بعد ۱۴ر دسمبر ۱۹۶۴ء کے روزنامہ "ڈان" کراچی میں یہ خبر نظر نواز ہوئی کہ وائس چانسلروں کا دو روزہ اجلاس ۲۷ر اور ۲۸ر دسمبر کو کراچی میں ہوگا جس میں یونیورسٹی آرڈی ننس اور طلبہ میں بے چینی کے اسباب کی گہری چھان بین کی جائے گی۔ اس معاملہ میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب محمد علی صاحب (مرحوم) نے نہایت مستحسن پیش قدمی سے کام لیا۔ ــــــ میں یہ عرض کرنے کی جرأت تو نہیں کرسکتا کہ وائس چانسلروں کی کمیٹی کا معرض وجود میں آنا میری شائع کردہ ناچیز تجویز کا نتیجہ تھا کیونکہ ؎

کون سُنتا ہے فغانِ درویش

البتہ اس کو توارُدِ خیال یا زیادہ سے زیادہ

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں　　　به غلط بر ہدف زند تیرے

کا مصداق متصور کر لیا جائے تو مناسب ہو گا۔

مزید خوش آیند بات یہ ہوئی کہ دسمبر ۱۹۶۴ء کی ۱۴ر تاریخ کو ہی صدر محمد ایوب خاں صاحب نے بھی ایک "یونیورسٹی کمیشن" کا تقرر فرما دیا، جس کے چیرمین جسٹس حمود الرحمٰن صاحب اور معزز ممبران میں جناب قاضی انوار الحق صاحب (سابق مرکزی وزیر تعلیم) شامل تھے۔ کمیشن مذکور کے تقرر کا ملک کے طول و عرض میں خیر مقدم ہوا۔ اس سے ہر طبقے کے لوگوں بالخصوص طلبہ کو خاطر خواہ اطمینان ہو گیا۔ اور جب کمیشن نے اپنا کام شروع کیا تو ہماری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسۂ ورکنگ کمیٹی نے بھی ۷ر فروری ۱۹۶۵ء کو ایک مبسوط و مدلل میمورنڈم کی منظوری دی اور اسے سکریٹری کمیشن کی خدمت میں بھیجا گیا۔ میمورنڈم میں "۱۹۵۹ء کے ایجوکیشن کمیشن" اور "یونیورسٹی آرڈی ننس" کی ان تمام شقوں پر مفصل روشنی ڈالی گئی تھی جن کی وجہ سے طلبہ، اساتذہ اور تعلیم گاہیں، بالخصوص پرائیویٹ تعلیمی ادارے مشکلات میں پڑ گئے تھے۔ اصلاحِ حال کی کچھ نئی تجاویز بھی سابقہ تجربات کی روشنی میں میمورنڈم میں شامل کی گئی تھیں۔

۲ر جنوری ۱۹۶۵ء کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں دوبارہ صدر پاکستان منتخب ہوئے اور تھوڑے عرصہ میں تمام پچھلی تلخیاں کم ہو گئیں اور عام ملکی حالات بھی بہت کچھ معمول پر آ گئے۔ تا آنکہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک

بھارت جنگ میں پوری قوم نے صدرِ محترم کی ایک آواز پر بے مثل ہم خیالی، یک جہتی اور ایثار و بہادری کا ثبوت دیا۔ ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک طلباء کی جماعت بھی پُرجوش طریقے پر سرفروشی کے لئے میدان میں نکل آئی اور ہماری قوم میں کوئی ایک طالب علم بھی ایسا نہ تھا جس نے ادائے فرض سے پہلو تہی کی ہو یا ملک سے غداری کی ہو۔ جنگ کے بعد معاہدۂ تاشقند پر نکتہ چینی ضرور ہوئی۔ جون ۱۹۶۷ء میں مشرق وسطیٰ کے المیۂ عظیم نے ثابت کر دیا کہ پاکستان نے نہ صرف کامیاب جنگ لڑی بلکہ بڑے تدبر و وقار کے ساتھ اسے بخوبی سمیٹ بھی لیا۔ اگر خدانخواستہ جنگ طول پکڑ جاتی تو اس کا بہت امکان تھا کہ ہمارا ملک دوسرا ویٹ نام بن جاتا۔

لیکن اللہ جانتے! ہمارے ملک میں وہ کون نادان دوست ہیں جو بنی بنائی بات کو بگاڑ ڈالتے ہیں۔ آخر بڑی بڑی مصالح ملکی کے مقابلہ میں یونیورسٹی آرڈی ننس کی ایسی کیا اہمیت تھی کہ اس کی ترمیم و تنسیخ کو ایک مسئلہ لاینحل بنا دیا گیا۔ ہماری ناچیز رائے میں اُس کی قیمت "ایک تجربہ" سے زیادہ نہیں۔ نظام تعلیم کو توانائی بخشنے کے لئے نہ معلوم ایسے کتنے تجربے کئے جاتے ہیں۔ کوئی کامیاب ہوتا ہے اور کوئی ناکامیاب۔ بصورتِ ناکامیابی حکومت کی آنا (Prestige) کا سوال کیوں بیچ میں آجاتا ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۶۹ء کو صدرِ محترم نے جب اپنی ماہانہ نشری تقریر میں کچھ اہم مطالبات کی منظوری کا اعلان فرمایا تھا تو

پالیسی ساز اداروں نے اس کے ساتھ ہی ساتھ فوری طور پر دوسرے ایسے اقدامات بھی کیوں نہ کر دیئے جس سے تنازعہ ختم ہو جاتا اور تعلیم گاہوں میں قیمتی وقت ضائع ہوئے بغیر کام شروع ہو جاتا۔

بہرحال۔ دیر آید درست آید۔ اصلاح حال کے اقدامات شروع ہو گئے ہیں اور توقع ہے کہ جلد از جلد طلبہ کی بے چینی دور ہو جائے گی۔

آخر میں ہماری مخلصانہ گذارش ہے کہ مندرجہ بالا تاریخی پس منظر کی روشنی میں ہمارے ارباب حل و عقد بالغ نظری سے کام لیں گے، ہمارے ملک کے طلبہ ابھی تک نہ انارکسٹ ہیں نہ انقلابی اور کمیونسٹ بلکہ انکی غالب اکثریت اسلام اور پاکستان کی فدائی ہے۔ ان سے سختی کے بجائے حسن سلوک کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ ہرگز سیاست دانوں کے آلہ کار نہیں ہیں اور نہ ان کو بوجوہ ہونا چاہیئے۔ پہلے بھی سیاستدانوں نے ان کے لئے کچھ نہ کیا اور نہ آئندہ کر سکیں گے۔ ہمارا ملک ایک بہت بڑے دشمن کی ہمہ وقت زد پر ہے۔ اس دشمن سے مقابلہ کے لئے نوجوانوں اور طالب علموں کو عمدہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ تیار ہونا ہے۔ رہی اندرون ملک کی عملی سیاست تو اُس کو حزبِ اتفاق و حزبِ اختلاف اور ان کی اپنی اپنی منتخب جماعتوں پر چھوڑ دینا چاہیئے ـــــ طالب علم اس میں کیوں دخل دیں۔

وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللہ

(دسمبر ۱۹۶۸ء)

۱۹۶۹ء کی تعلیمی پالیسی ـــــ ایک یادداشت

جناب ڈاکٹر آئی۔ ایچ عثمانی (سابق) سکریٹری مرکزی وزارت تعلیم حکومت پاکستان کا ایک گرامی نامہ مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۶۹ء ہماری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو موصول ہوا جس میں یہ دعوت دی گئی تھی کہ ہم لوگ گورنمنٹ کی جاری کردہ تعلیمی پالیسی کی تجاویز پر غور کریں اور ان کے بارے میں اپنا تبصرہ ۳۱ر جولائی ۱۹۶۹ء تک وزارت مذکور کو روانہ کر دیں۔ اس خط کی تعمیل میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے عہدہ داران و ارکان مجلس عاملہ اور کچھ ممتاز ماہرین تعلیم کا ایک مشترکہ اجلاس ۱۴ر جولائی ۱۹۶۹ء کو ۶ بجے شام صدر دفتر کانفرنس میں منعقد کیا جس میں حسب ذیل حضرات اور خواتین نے شرکت فرمائی (۱) جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب (ستارۂ پاکستان) (۲) مولوی سید حسین امام صاحب (۳) جناب سیٹھ ایس۔ ایم یوسف صاحب (۴) الحاج مولوی عظمت اللہ صاحب دہلوی ایڈووکیٹ (۵) پروفیسر محمد حامی الدین خاں صاحب (۶) نواب سید شمس الحسن صاحب (۷) خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ایم۔ اے (۸) ڈاکٹر سید معین الحق صاحب (۹) لفٹیننٹ کرنل آفتاب مختار صاحب (۱۰) ڈاکٹر نذیر احمد صاحب (۱۱) سید محمد تقی صاحب (۱۲) مسز سلمیٰ زین پرنسپل سرسید گرلز کالج (۱۳) مسز آمنہ کمال ایم۔ اے (۱۴) پروفیسر سید اظہر حسین رضوی صاحب (۱۵) ضیاء الدین احمد صاحب ایم۔ اے (۱۶) مسٹر محمد ضیاء الاسلام (۱۷) مسٹر

بشیر احمد صدیقی (۱۸) خواجہ سرور حسن صاحب بیرسٹر ایٹ۔لا (۱۹) پروفیسر مس انیتا غلام علی (۲۰) سید الطاف علی بریلوی۔

جلسہ کی کارروائی زیر صدارت جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس شروع ہوئی۔ دفتر کانفرنس نے گورنمنٹ کی مجوزہ تجاویز سے متعلق ایک یادداشت اس موقع کے لئے تیار کی تھی جو حاضرین میں تقسیم کی گئی اور جس کی علیحدہ علیحدہ شقوں پر تفصیلی بحث و گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو کم و بیش تین گھنٹے جاری رہی اور چونکہ ایک ہی نشست میں تمام مباحث کا احاطہ کرنا ممکن نہ تھا لہذا جلسہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۹ء ۶ بجے شام کیلئے ملتوی کیا گیا۔

---

۱۷ جولائی ۱۹۶۹ء کی دوسری نشست کی صدارت بھی جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب نے فرمائی جس میں جلسۂ سابق کے حاضرین کے علاوہ بیگم صاحبہ لفٹیننٹ کرنل شہاب الدین احمد صدیقی چیرمین سرسید گرلز کالج اور مرزا عاشق حسین صاحب سابق پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ و ممبر کانفرنس ورکنگ کمیٹی نے مزید شرکت فرمائی۔

اس نشست میں کانفرنس کی مذکورہ یادداشت کے ماسوا دوسرے متعلقہ موضوعات پر بھی طویل تبادلہ خیال ہوا۔ جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب۔ جناب خواجہ سرور حسن صاحب۔ جناب ضیاء الاسلام صاحب۔ ڈاکٹر معین الحق صاحب۔ کرنل آفتاب مختار صاحب پرنسپل دلی کالج اور صدر محترم نے خصوصیت کے ساتھ اپنی قیمتی آراء سے جلسہ کی رہنمائی کی۔ گورنمنٹ کی تجویز کردہ

سفارشات پر سیر حاصل تبادلۂ خیال کے بعد درج ذیل پانچ اصحاب کی میمورنڈم تیار کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی تشکیل پذیر ہوئی۔ (۱) جناب ضیاء الاسلام صاحب (۲) جناب مرزا عاشق حسین صاحب (۳) پروفیسر سید اظہر حسنین رضوی صاحب (۴) سید حامد علی جعفری صاحب (۵) سید الطاف علی بریلوی۔ آخر الذکر کو کنوینر مقرر کیا گیا۔ متذکرۂ بالا سب کمیٹی کی دو نشستیں علی الترتیب جناب ضیاء الاسلام صاحب اور سید الطاف علی بریلوی کے مکان پر ۲۰ اور ۲۱ جولائی سنہ ۱۹۶۹ء کو منعقد ہوئیں اور مرکزی وزارت تعلیم کو بھیجے جانے والے میمورنڈم کو ڈرافٹ کیا گیا۔ ڈرافٹنگ کے کام میں جناب ضیاء الاسلام صاحب نے اپنی پوری قابلیت اور مہارت کا ثبوت دیا۔

---

۲۹ جولائی سنہ ۱۹۶۹ء کو ۶ بجے شام مجلس عاملہ کا زیر صدارت جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ضروری ردّ و بدل اور ترمیم و اضافہ کر کے ڈرافٹنگ کمیٹی کے مرتبہ میمورنڈم کو باضابطہ طور پر پاس کیا گیا اور پھر اسے حسب قرار داد سابق ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۶۹ء کو مرکزی وزارت تعلیم حکومت پاکستان کو روانہ کر دیا گیا جس کی رسید مورخہ ۱۰ اگست سنہ ۶۹ء دستخطی جناب سید حیدر رضا رضوی صاحب ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر گورنمنٹ آف پاکستان منسٹری آف ایجوکیشن و سائنٹفک ریسرچ کانفرنس کو وصول ہو گئی۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا میمورنڈم ملک کے انگریزی

اخبارات میں خلاصتہً اور تفصیلاً شائع ہو چکا ہے اس کا اُردو ترجمہ جو جناب مرزا عاشق حسین صاحب ایم۔ اے اور سید الطاف علی بریلوی نے کیا، درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے مطالعہ سے حالیہ مسائلِ تعلیم کے صحیح طور پر سمجھنے میں بہت کچھ امداد ملے گی۔

حکومت پاکستان کی جدید تعلیمی پالیسی

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو اُن مقاصد سے اتفاق ہے جو گورنمنٹ کی شائع کردہ تجاویز کے کتابچہ صفحہ ۸ میں درج ہیں اور اُن سفارشات سے بھی اتفاق ہے جو تعلیمی ڈھانچہ کی تبدیلیوں سے متعلق ہیں کیونکہ یہ سفارشات مطلوبہ مقاصد کے بالراست نتائج ہیں۔ اس کانفرنس نے اپنی چند تجاویز مرتب کی ہیں جو ذیل میں درج ہیں اور جن کی غرض مجوزہ ایجوکیشنل پالیسی کو تقویت پہونچانا ہے۔ ان تجاویز کو مرتب کرتے وقت تعلیمی عمومیت، عوام کی ضروریات اور اقتصادی و ثقافتی تقاضوں سے ہم آہنگی کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اِنھیں اغراض کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کانفرنس کے نزدیک اُنتخابی اصولوں کے تحت جمہوری طریقہ پر نظام تعلیم کی تشکیل اور موجودہ نظم و نسق کو لامرکزیت کے ذریعہ دفتری شکنجہ اور لال فیتگی سے آزاد کرنا انتہائی اہم ہے۔

۲۔ اس کانفرنس کی رائے میں تمام مفادات میں مکمل توازن قائم کرنا چاہیئے تاکہ ایک قابلِ عمل نظام ہمارے متعینہ نظریات کے مطابق وجود میں لایا اور قائم رکھا جا سکے اور مطلوبہ مقاصد مسلسل اور بھرپور کوشش کے

نتیجہ میں حاصل کیے جا سکیں۔

۳۔ اس کانفرنس کی رائے میں ملک کے تعلیمی نظام کی نئی تشکیل میں مدرسوں کا انجذاب بہت مناسب ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ان اداروں کی مکمل انتظامی آزادی پر بھی زور دیتے ہیں کیونکہ ہم ان مدارس کے انتظامی معاملات میں حکومت کی مداخلت کے قطعی مخالف ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ مدارس عوام کی جدوجہد اور اوقاف کے سرمایہ سے قائم کیے گئے اور عرصہ سے چلائے جا رہے ہیں۔ سرکاری محکمۂ اوقاف کے تحت مدرسہ ایجوکیشن منتقل کرنے سے بہت نقصان پہونچا ہے۔ مدرسوں کے خود اختیاری انتظامات میں قطع و برید کی کوشش کی گئی ہے جو تعلیمی اور مذہبی اوقاف کے مقررہ اغراض کی خلاف ورزی کے مرادف ہے۔ لہذا صوبائی حکومت کے محکمہ تعلیم میں مدرسہ ایجوکیشن سے متعلق ایک علیحدہ شعبہ کا قیام ضروری ہے۔ جس کے فرائض میں مدرسوں کی خود ارادیت کا تحفظ اور اُن کی ہمہ جہتی ترقی کے بارے میں ہدایات جاری کرنا شامل کیا جائے۔ مدرسہ ایجوکیشن کے نصاب میں سائنس اور جدید علوم شامل کیے جائیں۔ جدید سماجی رجحانات سے مدرسہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیگانگی ختم ہونی چاہیے تاکہ عامۃ الورود غلط فہمیوں اور افرادی قوت کے ضیاع کا ازالہ ہو سکے۔ علوم کے ساتھ ساتھ جنرل ایجوکیشن کے مواقع فراہم کیے جائیں اور مختلف علوم کے خصوصی مطالعہ اور تحقیق کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ نیز مدرسوں کی اپنی خصوصیات اور انفرادیت کو ختم نہ ہونے دیا جائے۔ جدید

مضامین کے اجرار کے سلسلہ میں طلبا رہیں کام کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت کا پورا خیال رکھا جائے۔

۴۔ اس کانفرنس کو علم نہیں ہے کہ کوئی مشنری ادارہ کسی بیرونی ملک سے مالی امداد حاصل کر رہا ہے یا نہیں لیکن اگر ایسا ہے اور امداد دینے والا ملک امداد جاری رکھنا چاہے تو ایسے عطیات اندرون ملک اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ پر خرچ کیے جائیں۔ اور اس نوع کے اداروں کو نیشنل تحویل میں لانے کا اقدام بڑی احتیاط سے کیا جائے۔ متعلقہ فرقہ کے ایک یا دو نمائندوں کو انتظامیہ کمیٹی میں لازماً شامل رکھا جائے۔ کتابچہ کے پہلے باب میں پیرا ۱۶ کے تحت جن اداروں کو "اعلیٰ درسگاہوں" ـــــ (Superior Institutions) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ان کو قومی تحویل میں لانے کے بعد اپنی سابقہ سطح پر باقی رکھنا چاہیئے اور معیار تعلیم بدستور برقرار رکھنا چاہیئے۔ ساتھ ہی متعلقہ اقلیت کی مذہبی تعلیم کی سہولتیں بھی جاری رہنا چاہئیں عام اس سے کہ ایسے ادارے ماضی میں اپنے یہاں اسلامی تعلیمات کی شمولیت کے مخالف کیوں نہ رہے ہوں اور اپنے اداروں کے دوسرے کثیر التعداد طلبا کی مذہبی تعلیم پر اُن کو اعتراض نہ ہا ہو۔

ان پرائیویٹ اداروں میں داخلہ کے سلسلہ میں جو تیس ۳۰ روپے ماہوار یا اس سے زائد فیس لیتے ہیں اور جن کا ذکر اسی باب کے پیرا ۲۱ (۱) میں کیا گیا ہے یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ کیڈٹ کالجوں کی طرح سو فیصد داخلے قابلیت کی بنیاد پر کیے جائیں اور جو طلبہ اتنی بھاری

فیس ادا نہیں کر سکتے ہیں اُن کو بلا فیس تعلیم دی جائے۔ داخلہ کا استحقاق صرف قابلیت کی بنا پر ہو۔ پیرا ۱۷ کے فقروں ' ای۔ ایف اور جی سے کانفرنس کو پورا اتفاق ہے یعنی:۔

ذریعہ تعلیم شرقی پاکستان میں بنگلہ اور مغربی پاکستان میں اُردو ہونا چاہیئے۔

صوبائی حکومتوں کی سرکاری زبان (انگریزی) بدل کر علی الترتیب بنگلہ اور اُردو ۱۹۷۲ء تک کر دی جائے اور مرکز میں ان دونوں زبانوں کا استعمال پہلو بہ پہلو ۱۹۷۵ء تک شروع ہو جانا چاہیئے۔

دور افتادہ علاقوں میں تعلیم بہتر کرنے کے لئے خاص تدابیر اختیار کیجائیں!

۵۔ ناخواندگی بالغان کا استیصال اشد ضروری ہے۔ یہ کانفرنس ہر ایسی تحریک کا خیر مقدم کرتی ہے جو اس مقصد کے لئے جاری کی جائے۔ اس سلسلہ میں متعدد زنانہ کالجوں کی پرنسپلوں سے گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن کی یہ خواہش ہے کہ نیشنل لٹریسی کور میں خواتین کی شرکت بجائے لازمی کے اختیاری رکھی جائے جس سے اس کانفرنس کو اتفاق ہے بلکہ یہ بھی رائے ہے کہ جو طلبہ یا طالبات میڈیکل، انجینیرنگ اور ٹکنیکل اداروں میں داخلہ حاصل کریں اُن کو مذکورہ پابندیوں سے مستثنٰی کر دیا جائے۔

۶۔ سفارش مندرجہ باب سوم پیرا ۲ (ب) کی یہ کانفرنس تائید کرتی ہے کہ ثانوی سطح پر صنعتی اور حرفتی تعلیم میں طلبہ کی تعداد بڑھا کر ساٹھ فی صد کر دی جائے لیکن ساتھ ہی منصوبہ بندی کے ذریعہ مناسب روزگار

کے وسائل بھی پیدا کیئے جائیں تاکہ تعلیم سے فارغ ہونے پر یہ طلبہ ملک کے معاشی نظام میں جذب ہو جائیں، روزگار کے مواقع نہ ملنے سے مایوسی اور ناکامی کا شکار نہ ہوں اور اصلاحات کا اصل مقصد فوت نہ ہونے پائے۔ اس خصوص میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مطلوبہ سہولتیں بیک وقت ثانوی اور تحتانوی ٹکنیکل اداروں میں دہرائی نہ جائیں۔

۷۔ یہ کانفرنس مدرسین کی غیر طبقاتی برادری اصولاً پسند کرتی ہے اور ہماری نظر میں اساتذہ کے لئے تنخواہوں کا نیشنل اسکیل مستحسن ہے لیکن مالی دشواریوں کے پیشِ نظر ان تجاویز پر بالتفصیل غور کرنا ہوگا اور اُن واقعی ذمہ داریوں کی نوعیت اور حدود کا لحاظ کرنا ہوگا جو مختلف سطح کے مدرسین کو تفویض کی جائیں۔

۸۔ ایجوکیشنل ریسرچ کے بارے میں کانفرنس کا خیال ہے کہ اس ضروری شعبہ کو ماضی میں کلیتاً نظرانداز کیا گیا۔ اگر تعلیمی معیار کو بلند کرنا ہے تو اس خصوص میں پوری توجہ کرنی ہوگی۔ سفارش کی جاتی ہے کہ ابتداً مشرقی پاکستان میں ایک اور باعتبار وسعت رقبہ مغربی پاکستان میں ۲ دو ادارے ایجوکیشنل ریسرچ کے قائم کیئے جائیں۔

۹۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ متعدد پرائیویٹ درسگاہوں میں اُسی نوعیت کے سرکاری اداروں کے بہ نسبت اسٹاف اور تعلیمی سامان بہتر اور زیادہ ہے۔ برخلاف اس کے سرکاری اداروں کی لیبریٹری میں سامان کی کمی اور تدریسی معیار کی پستی کے سبب بالعموم تعلیم د

تربیت کا معیار گر گیا ہے جس کو جیسا کہ ہم سب سمجھتے ہیں بڑی حد تک بہتر بنایا جا سکتا ہے لہٰذا ایک طرف تو سرکاری اداروں میں معیار بلند کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور دوسری طرف اُن پرائیویٹ اسکولوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کی جائے جہاں پہلے سے معیار بلند ہے۔ اگر گورنمنٹ کی یہ خواہش ہے کہ تعلیمی سرگرمیوں میں لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تو پرائیویٹ اداروں کے بلڈنگ فنڈ میں پچاس فیصد گرانٹ دینی چاہیئے۔ اور اُن کو چلانے (Maintenance) میں جو کچھ خسارہ ہو اُس کو سو فیصد پورا کرنا چاہیئے۔ مزید براں جن پرائیویٹ اداروں کو گرانٹ دی جاتی ہے ان کے لیے قابلِ منظوری (Admissible) اخراجات کی فہرست وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ گورنمنٹ گرانٹ قابلِ منظوری اخراجات منفی رقوم فیس کے مساوی دی جائے۔ پرائیویٹ اداروں میں تنخواہوں کا اسکیل زیادہ رکھنا لازمی نہیں ہے لیکن قابل اور تجربہ کار اساتذہ کی ترغیب کے لیے اگر یہ ادارے سرکاری اسکیل سے تنخواہیں کچھ زیادہ رکھنا چاہیں تو کوئی اعتراض بھی نہ ہونا چاہیئے بشرطیکہ اس طرح جو مزید صرفہ ہو اُس کو متعلقہ ادارے خود برداشت کریں۔ اس مزید صرفہ کو قابلِ منظوری صرفہ کا جُزو قرار دینا لازمی نہیں ہے بلکہ اس کو فیس کے ذریعہ پورا کرنا چاہیئے۔ اس تجویز کا منشاء صرف یہ ہے کہ مالی عدم گنجائش کی بنا پر خود گورنمنٹ پرائیویٹ اداروں میں معیار اور سامانِ تعلیم کی بہتری کی کوششوں میں رکاوٹ کا سبب نہ ہو۔

جو ادارے عرصہ سے گورنمنٹ چلا رہی ہے وہ کوئی بڑی شہرت حاصل نہیں کر سکے لہذا جو علاج غیر معیاری پرائیویٹ اداروں کو سرکاری تحویل میں منتقل کرنے کا پیرا ۸ باب چہارم میں بتایا گیا ہے وہ ماہرین تعلیم یا عوام کی تائید اور پسندیدگی حاصل نہیں کر سکتا بر خلاف اس کے ہماری رائے میں پرائیویٹ اداروں کے لیے مقررہ ضابطہ تعلیمات کی پابندی لازمی قرار دیتے ہوئے صرف الحاق کے موقع پر اوّل درجہ معیار کے حصول پر اصرار کیا جائے اور اُس کی تکمیل کے بعد ان اداروں کے انتظام و انصرام سے سروکار نہ رکھا جائے اور جو ادارے معیار سے پست ہوں اُن کو بند کرنے کے بجائے گورنمنٹ کے زیر انتظام مثالی ادارے قائم کیے جائیں تاکہ طلباء اُنھیں تعلیم حاصل کرنا پسند کریں اور اُن کو ترجیح دیں۔ اس طریقہ کار سے خود بخود غیر معیاری پرائیویٹ اداروں کی تعداد میں کمی ہو گی اور سرکاری اداروں میں اضافہ ہو گا۔

در اصل پرائیویٹ اداروں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہونا چاہیے کیونکہ ہر منزل اور ہر سطح پر تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

۱۰۔ انتظامی اصلاحات مذکورہ باب پنجم کا جہاں تک تعلق ہے اس کانفرنس کی رائے میں گورننگ باڈی گیارہ افراد پر مشتمل ہو جس میں اکثریت بانیان۔ ماہرین تعلیم، معطیان اور عوام کے نمائندوں کی ہونی چاہیے۔ اسی طرح ڈسٹرکٹ اسکول اتھارٹی" کو بالراست گورنمنٹ کنٹرول سے

آزاد ہونا چاہیئے اور وہ کم از کم نو افراد پر مشتمل ہو نیز صوبائی حکومت کی نامزدگی کے بجائے اُس کے چیرمین کا انتخاب اُن اداروں کے سربراہ کریں جو اُس کے کنٹرول میں ہوں اور صوبائی حکومت کا نامزد کردہ صرف ایک نمائندہ اس انتظامیہ کا رکن ہو۔

۱۱۔ طلباء کی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے لئے مجوزہ نیشنل ٹیسٹ اسکیم کی غرض صرف ہدایت اور مشورہ ہو۔ طلبہ کی آزادی انتخاب ہر نوع باقی رکھی جائے۔ بسا اوقات آٹھویں جماعت تک پہونچنے پر طالب علم کی صلاحیتیں نمودار نہیں ہوتی ہیں اور بیشتر ذہنی توتیں عمدہ تعلیم کے زیر اثر اس وقت رونما ہوتی ہیں جبکہ اساتذہ ذاتی طور پر اپنے طالب علموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک ایسے ملک میں جہاں سوسائٹی طبقاتی عصبیت کے ساتھ مختلف طبقات میں تقسیم ہو یہ ضروری ہے کہ تعلیمی معاملات میں کنٹرول طلبہ اور اُن کے والدین کے ہاتھ میں رکھا جائے۔ جہاں تک سرکاری ملازمت کا تعلق ہے مختلف اسامیوں کے لئے صلاحیتوں کا جائزہ لینے کا سوال امیدواروں کا انتخاب کرتے وقت پیدا ہوتا ہے۔ طلبہ کی تعلیمی زندگی ایسے نظام کے تابع نہ ہونی چاہیئے جس کو ابھی نافذ کرنا ہے اور جس کی افادیت اُس کی آزمائش اور اثر پذیری پر منحصر ہے۔ اسی طرح تعلیمی رغبت و رجحانات کی توسیع کی وجہ سے جو بہتر اقتصادی اور معاشی معیار کے نتیجہ میں فی کس آمدنی بڑھنے سے پیدا ہو رہی ہے آئندہ مزید سرکاری اور غیر سرکاری کالجوں کی ضرورت باقی رہیگی لہذا سفارش مندرجہ پیرا ۱۸ باب پنجم قطعی مسترد ہونی

چاہیئے۔ اونچی سطح پر تعلیم نہ بڑھنے کی وجہ سے مزید یونیورسٹیوں کا قیام جو نئی ایجوکیشنل پالیسی کی تشکیل میں زیرِ تجویز ہے بحق بجانب نہ ہوگا۔ ہم اس سلسلہ میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ نئی الحاقی یونیورسٹیوں کا قیام صرف اُس وقت عمل میں آنا چاہیئے جبکہ واقعی ضرورت ہو اور اُس سے موجودہ یونیورسٹیوں کا درجۂ اوّل کا اسٹاف اپنی اسامیوں کو چھوڑ کر نئی یونیورسٹیوں میں بہتر مدارج حاصل کرنے پر مائل ہو جائے۔

۱۲۔ کانفرنس کی رائے ہے کہ گورننگ باڈی گیارہ ارکان پر مشتمل ہو جنمیں بانیانِ معطیان، اور طلبہ کے والدین کی نمائندگی چھ کی تعداد میں رکھی جائے اور گورننگ باڈی خود اپنا چیرمین منتخب کرے۔ لامرکزی نظام کے خود ارادی کالج کی انتظامیہ میں گورنمنٹ کے نامزد رکن کے فرائض واضح نہیں ہیں۔ ہماری رائے میں پرنسپل کا تقرر بحیثیت سکریٹری گورننگ باڈی مناسب نہیں ہے۔ گورننگ باڈی کو خود اپنے درمیان سے سکریٹری منتخب کرنا چاہیئے تاکہ پرنسپل کو تعلیمی امور میں پورا وقت صرف کرنے کا موقع مل سکے۔

آرٹس اور سائنس کے ڈین سے جس کا ذکر پیراگراف ۱۹ باب پنجم میں کیا گیا ہے غالباً مراد کالج کے آرٹس اور سائنس کے صدر شعبہ سے ہوگی نہ کہ الحاق کنندہ یونیورسٹی کے ڈین سے۔ آخرالذکر خود اپنی منصبی مصروفیتوں کے سبب خاطر خواہ وقت کالجوں کی گورننگ باڈی کے ارکان کی حیثیت سے مزید فرائض انجام دینے کے لیئے نہ دے سکیں گے۔

۱۳۔ اس کانفرنس کی رائے میں ایک مزید گورنمنٹ میڈیکل کالج کا

کراچی میں بلا تاخیر قیام نہایت ضروری ہے اور ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ کا موجودہ صوبائی کوٹا ختم کر دینا چاہیئے۔ جس علاقہ میں میڈیکل کالج کھولا جائے اُسی علاقہ کے طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لئے اُس کو مخصوص رکھنا چاہیئے۔
اُمیدواروں کا داخلہ اِن اداروں میں محض قابلیت کی بنا پر ہونا چاہیئے اور ایسے طلبہ کو جو قابلیت کا مطلوبہ معیار تو رکھتے ہیں لیکن غیر مستطیع ہیں کافی مقدار میں وظائف دئے جائیں۔ ایسے واقعات سُننے میں آتے ہیں (جو ممکن ہے غلط ہوں) کہ زیر نشستیں افراد متعلقہ کی ذاتی منفعت کا ذریعہ بنائی جاتی ہیں (بعد تحقیق) اس کا سدِ باب لازمی ہے۔
۱۴۔ کراچی میں ایک انجینیرنگ یونیورسٹی کی اشد ضرورت ہے جسمیں داخلہ مذکورہ بالا شرائط ہی پر موقوف ہو یعنی صرف ایسے اُمیدوار داخل کئے جائیں جو مطلوبہ قابلیت کے علاوہ کراچی کے باشندے (domicile) ہوں۔
۱۵۔ تعلیم نسواں کا جہاں تک تعلق ہے سابقہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی طرح سارے ملک میں مفت ہونا چاہیئے۔ اور پرائیویٹ ادارے برائے خواتین کو کافی سرکاری امداد ملنی چاہیئے۔ اُن اوقاف کی آمدنی جو ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے قائم کئے گئے ہیں خواتین کو تعلیم پر فیاضانہ صرف کی جائے اور جو کچھ کمی ہو وہ گورنمنٹ گرانٹ کے ذریعہ پوری کی جائے۔ کانفرنس کے خیال میں قومی تعلیم کا یہ شعبہ نہایت اہم ہے لہٰذا اس کو تعلیم بالغان کے مساوی درجہ دینا چاہیئے۔ مزید برآں کراچی

جیسے بڑے شہروں میں خواتین کے لئے علیحدہ میڈیکل کالج کا قیام قطعی لازمی ہے۔

۱۶۔ پیرا نمبر ۱ باب ششم کے سلسلہ میں اس کانفرنس کی رائے میں یہ دیکھنا پرنسپل کی ذمہ داری ہے کہ اساتذہ کی تخلیقی سرگرمیوں سے اُن کے اپنے پیشہ کے فرائض کی ادائیگی میں خلل واقع نہ ہو لیکن مالی حالت درست کرنے کے لئے پرائیویٹ ٹیوشن اختیار کرنا ممنوع نہ ہو بشرطیکہ یہ پرائیویٹ ٹیوشن پرنسپل کی اجازت سے اُن اوقات سے باہر کی جائے جو فرائض منصبی کے لئے متعین کئے جا چکے ہیں اور ۲ ½ گھنٹے سے زائد وقت نہ صرف کیا جائے۔ نیز کسی ٹیچر کو دو مختلف اسکولوں میں کام کرنے کی اجازت نہ دی جائے البتہ ایک ہی اسکول کی دو شفٹوں میں حسب ضرورت اُس کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس باب کے گیارھویں پیرا کا آخری جملہ جو کھیل اور ورزش کی فیس سے متعلق ہے حذف کر دیا جائے۔

۱۷۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ پانچویں باب کا اکتیسواں پیرا اور صفحہ ۵۸ ضمیمہ (ب) کا دسواں پیرا دونوں جدید تعلیمی پالیسی کی متعینہ اغراض کے منافی ہیں لہذا ہماری رائے میں اسپیشل درجہ کا کوئی کالج نہ ہونا چاہیے اور اگر اس نوع کا کوئی کالج جنرل قومی پالیسی کی مطابقت سے انکار کرے تو متعلقہ یونیورسٹی کو اُس کا الحاق ختم کر دینا چاہیے۔ چنانچہ انھیں وجوہ کی بنا پر ضمیمہ (ب) کا دسواں پیرا مسترد کر دینا چاہیے۔

پرائیویٹ اداروں سے متعلق شیڈول کے بارے میں یہ تجویز ہے کہ جب تک نیشنل سلیبس اسکیم وجود میں نہ آئے اُس وقت تک مدرسین

کے طبی اخراجات کی ادائیگی گورنمنٹ کے ذمہ رہنا چاہیئے۔ شیڈول مذکور کے پیرا ۹ کے تحت ملازمت سے برخاستگی کی وجہ "نافرمانی" بالتصریح درج ہونی چاہیئے۔

اضلاعی مسائل کے ضمن میں باہمی جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کے لئے پیرا ۱۰ میں واضح طور پر بتایا جائے کہ اپیل کی سماعت کا اختیار کس کو ہوگا۔ پراویڈنٹ فنڈ ۶ ۱/۴ سے زائد نہ ہو۔ گروپ بیمہ اسکیم جاری کی جائے پریمیم کی ادائیگی پراویڈنٹ فنڈ کی تحویل سے کی جائے۔

۱۸۔ اس کانفرنس نے اظہار رائے کو اہم تجاویز تک دانستہ محدود رکھا ہے کیونکہ ہم عملی اور انتظامی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے ہیں۔ ان مسائل کا تعین و ترتیب موجودہ اور زیرِ تبصرہ تجاویز کے تحت آئندہ قائم ہونے والے محکمے کریں گے۔

"نیشنل لٹریسی کور" اور دیگر متعلقہ معاملات کے سلسلہ میں ہماری مفصل رائے علیحدہ پیش کی جائیگی۔

۱۹۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کا جہاں تک تعلق ہے یہ کانفرنس انتخاب کنندہ جماعتوں کی شمولیت کا خیر مقدم کرتی ہے اور ان اداروں کی تعلیمی سرگرمیوں میں مختلف عناصر کا انجذاب ناگزیر خیال کرتی ہے۔ بعض سیکٹروں (دائرہ عمل) میں طلبہ کی شمولیت مشاورتی حیثیت سے قابلِ ترجیح ہے تاکہ دوطرفہ رابطہ طلبہ کی انجمنوں اور یونیورسٹی کی منتظمہ کے درمیان قائم ہوسکے مگر اس رابطہ میں کسی ایسے دباؤ کو دخل نہ ہو جو معیار یا ضبط و تنظیم کی تنزلی کا موجب

ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ہر تعلیمی ادارے کی اولین اور اہم ترین ذمہ داریاں ہیں۔

اس کانفرنس کا پر زور مشورہ ہے کہ ٹیوٹوریل سسٹم کی توسیع کی جائے۔ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان کلاس کے اندر اور باہر ازادانہ تبادلۂ خیالات کے لیے یونیورسٹیوں میں تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعہ موافق ماحول بنایا جائے جس سے طلبہ میں وسعتِ نظر پیدا ہو اور وہ ایک ابھرتی ہوئی سوسائٹی کے کارآمد رکن بن سکیں اور اس صحیح نظر کا ذمہ دارانہ احساس اُن میں پیدا ہو جس کے لئے ہم خود کو وقف کر چکے ہیں یعنی اسلامی اخوت و مساوات، اور تحصیل و تحقیق علوم کے اعلیٰ معیار کا حصول، تاکہ قومی تعمیر کی جد وجہد میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی معلومات سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ ہم اس امر پر زور دیتے ہیں کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اپنے اداروں میں صحت بخش علمی مقابلہ اور تحصیل علم کے جذبہ کی مناسب فضا پیدا کریں۔ اس مہم میں وہ پوری قوم کی حمائت پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح طلبہ بھی اپنے تعلیمی مشاغل میں کسی امر کو خلل انداز نہ ہونے دیں اور اپنا پورا وقت مسلسل تحصیل علم میں صرف کریں تاکہ یونیورسٹی سے باہر نکلنے کے بعد وہ اس سخت تنازع للبقا کی دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

۲۰۔ اس کانفرنس کا خیال ہے کہ مذکورہ پروگرام اور پالیسی کے تمام پہلوؤں پر نیز اسٹاف، مالیات اور کام کی مقدار وغیرہ پر غور کر لیا گیا ہوگا اور ماہرین نے مجوزہ منصوبہ کے قابل عمل ہونے کے امکانات کی جانچ پڑتال بھی کرلی ہوگی۔ ان مسائل پر یہ کانفرنس اپنی رائے دینے سے قاصر ہے۔ لیکن توقع کرتی ہے کہ زیر تبصرہ تجاویز کی تعمیل اور تکمیل کیلئے مطلوبہ وسائل مہیا ہو جائینگے۔

(دسمبر ۱۹۵۹ء)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت

رنگِ شگفتہ، صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

ستمبر ۱۹۴۹ء سے عہدہ داران و کارکنان آل پاکستان کانفرنس صدر دفتر کانفرنس کی ذاتی عمارت بنانے کی سعئ بلیغ کر رہے ہیں۔ بی روڈ ناظم آباد متصل سرسید گرلس کالج پر دفتر کی موجودہ کرایہ کی عمارت کے قریب ہی ایک نہایت موزوں اور مناسب پلاٹ کی خریداری کرلی گئی، اہلِ علم حضرات واقف ہیں کہ علی گڑھ میں کانفرنس کی ذاتی عمارت سلطان جہاں منزل کے نام سے موجود تھی اس عمارت کا احاطہ مسلم یونیورسٹی میں اپنی خوبصورتی، پائیداری اور وسعت و کشادگی کے اعتبار سے بہترین عمارتوں میں شمار تھا خصوصیت سے کانفرنس کا ہال تو قابل دید تھا۔ اس عمارت سے ملحق اسٹاف کے مکانات تھے۔ علاوہ بریں کم ازکم دس ایکڑ کا سرسبز و شاداب باغ تھا جس کے ایک لب سڑک حصہ کو راقم نے اپنے زمانۂ خدمت (۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۰ء) میں کٹوا کر ۲۹ دوکانوں اور ۳۳ رہائشی مکانات تعمیر کرائے تھے جن کی کل آمدنی ضرورتمند طلبہ و طالبات کو وظائف دینے کے لئے مخصوص تھی ایک خوبصورت چھوٹی سی مسجد بھی بنوائی تھی جسے بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا۔

سلطان جہاں منزل کی تعمیر سے قبل دفتر کانفرنس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ۱۸۸۶ء میں جبکہ کانفرنس کا افتتاح ہوا سرسید علیہ الرحمۃ کے انتقال مارچ ۱۸۹۸ء تک کانفرنس کا کام کالج کے کاموں کے ساتھ ساتھ سرسید کی کوٹھی پر ہوا کرتا تھا۔ سرسید کے بعد نواب محسن الملک ان کے جانشین ہوئے تو انھوں نے بھی اپنی کوٹھی پر ہی کانفرنس کے دفتر کو رکھا۔ ۱۹۰۶ء میں جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کانفرنس کے آنریری جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے تو آپ نے سب سے پہلے کالج کے ایک کمرہ میں باضابطہ دفتر قائم کیا۔ مگر کچھ مدت بعد کالج کی ضروریات کی وجہ سے یہ کمرہ چھوڑنا پڑا تو کالج ہی کے ایک چھوٹے خس پوش بنگلہ میں جو موجودہ مسلم یونیورسٹی یونین کے بغل میں واقع تھا دفتر کو منتقل کیا گیا۔ لیکن کانفرنس کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے یہ مقام بہت جلد ناکافی اور غیر موزوں ثابت ہوا اور ۱۹۱۳ء میں جب سرمایہ کی طرف سے کچھ اطمینان ہو گیا اور کانفرنس کی حیثیت بطور ایک مستقل شاندار اور فیض رساں ادارہ کے مسلّم ہو گئی تو شروع ۱۹۱۴ء اور پھر ۱۹۱۵ء میں صاحبزادہ صاحب نے بھوپال کے دو سفر کیے اور ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ ریاست بھوپال سے گرانقدر عطیات حاصل کر کے نیز یونیورسٹی سے زمین لے کر ۲۷ فروری ۱۹۱۴ء کو ایک عظیم الشان جلسہ میں بیگم صاحبہ کے ہاتھوں رسم تاسیس ادا کرائی۔ اس موقع پر شیخ سعدیؒ کا ایک مشہور قطعہ (بہ تلمیح ضروری) بھی پڑھا گیا جو درج ذیل ہے:

نہ قدر و شوکتِ "سلطان" نہ گشت چیزے کم
ز التفات برایں ملتِ پریشانے!

کلاہِ گوشۂ ملت بہ "آفتاب" رسید
کہ سایہ بر سرش انداخت چوں تو "سلطانے"

۱۹ فروری سنہ ۱۹۱۶ء کو جلسۂ تاسیس کی طرح کانفرنس کی عمارت کا "جلسۂ افتتاح ہوا" جس میں ہر ہائی نس سلطان جہاں بیگم اور پرنس حمید اللہ خان بہادر بہ نفسِ نفیس تشریف لائے۔ یہ جلسہ علی گڑھ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہا۔

اس موقع پر بھی ایک قطعۂ تاریخ پیش کیا گیا جو یہ ہے۔

ایں مرکزِ تعلیمی واں دائرۂ علمی
از فضلِ خداوندی چوں گشت بنائے دل
برجستہ رقم کردہ بِکلکِ سنِ تعمیرش
ایں خوب شدہ زیبا "سلطان جہاں منزل"
۱۳۳۴ھ

سنہ ۱۹۱۶ء کے ماہ دسمبر میں میاں سر محمد شفیع کی صدارت میں کانفرنس کا تیسواں ۳۰ سالانہ اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل کے رکن منتخب ہو کر انگلینڈ تشریف لے گئے، روانگی سے قبل صاحبزادہ صاحب نے نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ مولانا سید طفیل احمد منگلوری۔ خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں صاحب، مولانا محمد علی، تصدق احمد خاں شروانی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، جناب عبدالمجید خواجہ۔ ڈاکٹر نثار احمد بریلوی۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی اور پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ کانفرنس کے کام کی جو توسیع کی گئی ہے اس کو بیش از بیش ترقی دیں۔ ان سب حضرات نے اپنے

بشیر و بزرگوں کی طرح ادارہ کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ملت اسلامیہ کی تعلیمی پستی کو دور کرنے کے لئے ضروری تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے جانشین خاص مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور اُن کے حبیب لبیب مولانا سید طفیل احمد صاحب نے بتیس سال تک مسلسل کانفرنس کی نہایت زریں خدمات انجام دیں۔ العلم کے صفحات میں نیز اپنی کانفرنس کی مطبوعات کے ذریعہ ہم قیام پاکستان سے قبل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ساٹھ سالہ قیمتی خدمات پر بار بار اور تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں۔

جب ملک تقسیم ہوا اور ہندوستان و پاکستان کی دو علیحدہ آزاد مملکتیں وجود میں آگئیں تو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی تاج محل۔ جامع مسجد دہلی۔ لال قلعہ۔ مسلم یونیورسٹی۔ جامعہ عثمانیہ۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔ ندوہ اور دارالعلوم دیوبند کی طرح انڈیا کے حصہ میں آگئی۔ کانفرنس کی بلند و بالا عمارتیں اُس کا شاندار کتب خانہ گراں قدر تاریخی ریکارڈ۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کا عطا کردہ سرمایہ محفوظ سب وہیں رہ گیا اور مارچ سنہ ۱۹۵۰ء میں جب پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی کراچی میں تشکیلِ نو کی گئی تو اللہ کے نام کے سوائے ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا لیکن بقولے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

جناب الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب مرحوم و مغفور، جناب حسن علی عبدالرحمٰن صاحب بار ایٹ لا اور مرزا ممتاز حسن قزلباش نے بہ کمال جذبۂ قومی و ملی دستگیری فرمائی۔ جناب حسن علی صاحب کی مہربانی سے سندھ مدرسہ کی

عمارت میں ایک کمرہ مل گیا جس میں پانچ سال تک قیام، ادارہ کے تمام ابتدائی مراحل کامیابی کے ساتھ طے ہوئے۔ سندھ مدرسہ کے زمانہ ہی میں قیامِ سرسید کالج کی تجویز پروان چڑھی اور جولائی ۱۹۵۴ء میں اس کی تاسیس عمل میں آئی۔ اور جب کالج دوسری بڑی عمارت میں چلا گیا تو دفتر کانفرنس کو بھی جون ۱۹۵۶ء میں کالج سے متصل کرایہ کے مکان میں منتقل کر لیا گیا خدا کے فضل و کرم سے سرسید گرلس کالج کی شاندار عمارت بن گئی اور اس میں بیش از بیش اضافہ کا سلسلہ جاری ہے ـــــ مگر اب عین وقت ہے کہ خود صدر دفتر کانفرنس کی ذاتی عمارت بھی بن جائے کیونکہ کرایہ کا موجودہ مکان اُس کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے قطعاً ناکافی ہو چکا ہے ـــــ نیز کسی بھی ادارہ کے استقلال و دوام کے لئے اس کی ذاتی عمارت کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ مثلاً مسلم لیگ کی کوئی ذاتی عمارت نہ ہندوستان میں تھی اور نہ پاکستان میں بن سکی نتیجہ میں اس کا وجود ہمیشہ غیر یقینی رہا اور ہم کسی ایک جگہ کو متعین کر کے یہ نشاندہی نہیں کر سکتے کہ یہ مسلم لیگ ہے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں قائد ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب مرحوم سے نئی دہلی میں ملا۔ اور میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی مسلم لیگ کے دفتر سے آرہا ہوں تو فرمانے لگے کہ دفتر تو آپ کی کانفرنس کا ہے، جب مسلم لیگ کا بھی دفتر بن جائے گا تو اسے دیکھئے گا۔ افسوس ہے کہ مرحوم کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور نہ آئندہ اس کے روبہ عمل آنے کا کوئی امکان نظر آرہا ہے۔

بقول جناب ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس "سرسید گرلس کالج سرسید کے نام پر قائم کیا گیا ہے اور ایجوکیشنل کانفرنس کو خود سرسید نے قائم کیا تھا۔ اس کا وجود ایک عظیم رہنمائے ملت کی ایک عظیم نشانی (SYMBOL) ہے، جب تک سرسید کا نام روشن ہے "جو ابدالاباد تک رہے گا" ان کی قائم کردہ ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود بھی باقی اور تابناک رہنا چاہیئے۔"

مندرجۂ بالا تاریخی پس منظر اور تاثرات کے پیش نظر کانفرنس کی ذاتی عمارت بنانے کا بیڑا اٹھایا گیا ہے جس کے لئے موجودہ کروڑوں اور اربوں کی دنیا میں صرف دو لاکھ روپے کی ضرورت ہے چنانچہ عہدہ داران کانفرنس جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب (ستارۂ پاکستان) صدر، جناب سید حسین امام صاحب نائب صدر۔ جناب حسن علی عبدالرحمن صاحب بار ایٹ لا آنریری جنرل سکریٹری، جناب سیٹھ ایس۔ ایم یوسف صاحب آنریری ٹریژرر اور ممبران ورکنگ کمیٹی میں سے جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب سابق چیرمین شعبۂ ریاضی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ جناب افتخار حسین صاحب اسسٹنٹ جنرل منیجر الیسو۔ جناب سیٹھ فدا حسین ماروی عطروالا۔ جناب الحاج افتخار علی قاضی ایڈووکیٹ (سابق ایم۔ ایل۔ اے۔ سی۔ پی) جناب مرزا علی اظہر برلاس صاحب چیرمین عبداللہ کالج۔ جناب مرزا عاشق حسین صاحب (سابق پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ) جناب نواب سید شمس الحسن صاحب ایڈووکیٹ اور راقم نے ایک اپیل فراہمی سرمایہ کے لئے جاری کی جس کا خدا کے فضل وکرم سے بہت اچھا خیر مقدم

ہو رہا ہے معززین قوم سے ہماری مخلصانہ درخواست ہے کہ وہ اس اہم قومی کام میں ہاتھ بٹائیں اور جلد از جلد اپنے گرانقدر عطیات ارسال کر کے ہمیں اس قابل بنا دیں کہ ایک شاندار جلسۂ تنصیب عمارت کانفرنس منعقد کر کے اپنے تمام معاونین اور ہمدردوں کو اسمیں شرکت فرمانے کی مسرت حاصل کریں۔

جہاں تک گذشتہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات کا تعلق ہے وہ عام طور پر معروف و معلوم ہیں خصوصاً سرسید گرلز کالج کا قیام۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کا اجرا جو اس وقت تک ستر کے قریب بلند پایہ کتابیں شائع کر چکی ہے اور اسی تعداد میں مشہور سہ ماہی رسالہ 'العلم' کے شمارے طبع کر چکی ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کی فری پبلک لائبریری ریڈنگ روم اور میوزیم نیز ماہانہ علمی و ثقافتی جلسوں کا انعقاد مشتے نمونہ از خروارے قابل ذکر ہیں۔ اپنی عمارت ہو جانے کے بعد تعمیر قومی و ملی کے کاموں کو انشاء اللہ مزید وسعت دی جائے گی۔ اور حسب سابق ہم اپنے معطیان کو ان کے ایثار کے بدلہ میں مایوس ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔

حرفِ مکرّر بروز جمعہ ۱۹ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۰ نومبر سنہ ۱۹۷۱ء ایک شاندار جلسہ جو جناب ممتاز حسن صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ کانفرنس کی عمارت یوسف (میموریل ہال) کا جناب ایس۔ ایم۔ عالم نے سنگ بنیاد رکھا اور یکم جنوری سنہ ۱۹۷۲ء کو جب پہلی منزل کا تین چوتھائی حصہ بن گیا تو اس میں دفتر۔ لائبریری۔

میوزیم اور متعلقہ کارخانہ جلد سازی کو منتقل کردیا گیا۔ اس وقت تک Rs.1,02869/25 خرچ ہوئے اور Rs 79,755/40 کا چندہ جمع ہوا۔ معطی حضرات کی فہرستیں کانفرنس کے رسالہ "العلم" میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ (ستمبر ۱۹۶۹ء)

عہدِ خلفائے راشدین میں تعلیم

اِس موضوع پر گفتگو سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ عہد خلفائے راشدہ کو ہم پیغمبر اسلام حضور ختمی مرتبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں میں از ابتدا تا ایں دم جملہ تعلیمی سرگرمیوں کا سرچشمہ اور سبب قرآن مجید ہے جو ایک مکمل نصب العین عطا کرتا ہے۔ اس سے ہٹ کر جو نظریات اور نصب العین بنائے گئے، وقت گذرنے پر ان کی تغلیط ہو گئی۔

سقراط، افلاطون اور ارسطو وہ یونانی حکما تھے جنھوں نے قبل اسلام اصول تعلیم وطریقۂ تعلیم کے متعلق اپنے نظریئے قائم کئے۔ بعد ازاں بکن اور روسو نے ان سے مختلف اور نئے نظریات پیش کئے۔ عرصہ تک اہلِ یورپ ان کی صحت پر یقین کامل رکھتے تھے مگر ان کے بعد پستالازی۔ فردبل۔ ہربرٹ اسپنسر۔ رسکن۔ ڈیوی میکڈوگل۔ فرائڈ۔ ایڈلر اور کارل مارکس نے اپنے اپنے زمانوں میں ایسے نقطہائے نظر پیش کئے، جو ایک دوسرے سے اکثر مختلف اور متضاد تھے۔ اور زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھی اپنے نظریات بدلتی رہی۔

تعلیمی وعلمی میدان میں مسلمانوں کے گوئے سبقت لے جانے کا سبب

خود دین اسلام تھا جس نے مسلمانوں میں وہ خصوصیات پیدا کر دی تھیں جن کے باعث وہ دنیا کے ایک بڑے حصّہ کے حاکم اور معلم کے منصب پر فائز ہوئے۔ دین اسلام کی اساس قرآن حکیم ہے اور جو کچھ قرآن میں نازل ہوا وہی خلفائے راشدین کے نظام و نظریات تعلیم کی اساس ٹھہرا جس سے ان بزرگوں نے سرِ مو انحراف نہیں کیا۔ آیئے دیکھیں کہ قرآن پاک میں علم اور تعلیم کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام بلاغت نظام میں جابجا علم کی فضیلت اور اس کے حصول کی تاکید فرمائی۔ اسلام میں علم اور دین دونوں اس طرح وابستہ ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو سب سے پہلی وحی یہ آئی کہ "پڑھ اپنے اس پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے تجھے پیدا کیا اور قلم سے لکھنا سکھایا۔" یا دوسری جگہ فرمایا گیا "اور تم کو وہ باتیں سکھا دی ہیں جو تم کو پہلے معلوم نہ تھیں۔" ایک اور جگہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا "آپ دعا کیجئے کہ اے پروردگار میرا علم اور زیادہ کر۔" اہل علم کی ہمت افزائی کے لئے فرمایا گیا "اللہ ان لوگوں کے درجے بلند کرے گا جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا۔"

اسی طرح بکثرت احادیث میں علم اور تحصیل علم کی تاکید کی گئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ علم حاصل کرو، اس لئے کہ جو اُسے خدا کے لئے حاصل کرتا ہے وہ نیکی کا کام کرتا ہے۔

۲۔ جو شخص علم کے بارے میں بات چیت کرتا ہے وہ گویا خداوند تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے۔

۳۔ جو حصولِ علم کے لیے سعی کرتا ہے۔ اللہ کی عبادت کرتا ہے۔

۴۔ جو علم کی اشاعت کرتا ہے وہ گویا زکوٰۃ دیتا ہے اور جو علم کا صحیح استعمال کرتا ہے وہ خدا کی پرستش کرتا ہے۔

۵۔ علم نیکی و بدی میں تمیز کرنا سکھاتا ہے اور خدا تک پہنچنے کے لیے روشنی کا کام دیتا ہے۔

۶۔ علم صحرا میں ہمارا رفیق ہے اور تنہائی میں مونس ہے وہ خوشی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور مصیبت میں ہمیشہ ہمت قائم رکھتا ہے۔

۷۔ دوستوں میں علم ہماری زینت کا باعث ہے اور دشمنوں کے خلاف ڈھال کا کام دیتا ہے۔

۸۔ علم ہی کے ذریعہ انسان نیکی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچتا ہے۔

۹۔ ایک عالم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

۱۰۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

۱۱۔ علم حاصل کرو۔ چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے۔

۱۲۔ ماں کی گود سے لے کر قبر تک علم حاصل کرتے رہو۔

اسلام سے پہلے قبیلۂ قریش میں جو ہر اعتبار سے بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکاماتِ الٰہی کی تعمیل میں سب سے پہلے مسجد نبوی میں ایک چبوترہ

بنوا دیا تھا۔ جس پر سائبان تھا اور اسے صفہ کہتے تھے۔ دن کو یہ مدرسہ بن جاتا تھا اور رات کو بورڈنگ اور دارالاقامہ۔ اعلیٰ تعلیم خود آنحضرت صلعم دیتے۔ لیکن ابتدائی تعلیم لکھنا پڑھنا سکھانا نوجوان صحابیوں کے سپرد تھا۔ صفہ میں مسلمانوں کو قرآن مجید و فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور فن تجوید بھی سکھایا جاتا تھا۔ ہفتہ میں ایک بار آنحضرت صلعم صرف عورتوں کے مجمع میں تشریف لے جاتے۔ ان کی تعلیم کی نگرانی فرماتے اور ان کے سوالات کے جوابات دیتے تھے۔ ازواج مطہرات کے ذمہ یہ فریضہ تھا کہ وہ خواتین کو تعلیم دیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رض کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

رسول اللہ صلعم کے بنائے ہوئے تعلیمی دستورالعمل کے مطابق خلفائے راشدین نے توسیع تعلیم کے لئے کوششیں کیں۔ پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تو اس وقت دس لاکھ مربع میل کے رقبہ پر اسلامی مملکت قائم ہو چکی تھی جس میں حضور صلعم کے بنائے ہوئے نظام تعلیم کو رواج دیا گیا۔ چنانچہ مختلف علاقوں کے عمال حکومت کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ اپنے علاقہ کی تعلیمی ضرورتوں کا انتظام کریں۔ جگہ جگہ ناظر تعلیمات مقرر کئے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصرار سے آپ ہی کے زمانہ میں کلام اللہ کی تدوین ہوئی۔ مفتوحہ علاقوں میں قرآن کی تعلیم کے مکتب قائم کئے گئے اور تنخواہ دار معلم مقرر ہوئے۔ ان مکتبوں میں کتابت کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ بدوؤں کے لئے قرآن کی تعلیم ایک گونہ جبری تھی۔ ایک معلم

ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ چند آدمیوں کے ساتھ اس کام پر مامور کئے گئے کہ وہ قبائل میں پھر کر ہر شخص کا امتحان لیں اور جس کو قرآن کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اُسے سزا دیں۔ سورۂ بقرہ۔ نساء۔ مائدہ۔ حج اور نور کا یاد کرنا ضروری قرار دیا۔ قرآن پاک کے صحیح پڑھنے اور اعراب کی تصحیح کے لئے ادب، و عربیت کی تعلیم کی تاکید کی گئی جو لوگ لغت کے عالم نہ ہوتے تھے انھیں قرآن کی تعلیم دینے کی ممانعت کر دی گئی۔ قرآن کے طلبہ کے لئے وظائف مقرر کئے۔ ان تدبیروں سے ہزاروں حفاظ قرآن پیدا ہو گئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت توسیع و اشاعت تعلیم کے لئے زریں دور خیال کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر نہایت ذہین، طباع، بالغ نظر، مدبر اور صائب الرائے تھے۔ جاہلی اور اسلامی دونوں علوم میں آپ کو یکساں کمال حاصل تھا۔ فصاحت و بلاغت، انشاء، خطابت، شاعری۔ طلاقت لسانی اور سپہ گری کی صفات عالیہ میں آپ کو حصہ وافر ملا تھا۔ آپ نے عرب کی شاعری میں بڑی اصلاح کی۔ آپ کو عبرانی زبان پر بھی عبور تھا۔ آپ کے زمانہ میں صیغۂ تعلیم کا سب سے بڑا کام اشاعت اسلام تھا جس کے یہ معنی تھے کہ تمام دنیا کو اسلام کی دعوت دی جائے اور لوگوں کو اسلام کے اصول اور مسائل سمجھا کر اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ حضرت عمر فوج کے جو افسر مقرر کرتے تھے ان کی بابت بھی پہلے یہ دیکھ لیتے تھے کہ وہ صاحب علم اور صاحب فقہ ہیں یا نہیں۔ افسروں کے لئے علم فقہ کی ضرورت اسی تبلیغ اسلام یعنی اشاعت علم کی خاطر تھی۔

اہلِ فوج کو جو ضروری ہدایتیں دے کر بھیجا کرتے تھے ان میں یہ بھی ہوتا تھا کہ قرآن مجید پڑھنا سیکھیں۔ آپ قرآن خوانوں کا رجسٹر بھی منگوا کر دیکھتے تھے۔ ان تدبیروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ بے شمار آدمی قرآن پڑھ گئے۔ ناظرہ خوانوں کا تو شمار نہ تھا۔ اس طرح حافظوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ایک مرتبہ جب فوجی افسروں کو اس مضمون کا خط لکھا کہ حفاظِ قرآن میرے پاس بھیج دو تاکہ میں ان کو قرآن کی تعلیم کے لئے جابجا بھیجوں تو حضرت سعد بن وقاص رضؓ نے جواب میں لکھا کہ صرف میری فوج میں تین سو حافظ موجود ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کے بعد حدیث کی ترویج کی بھی بہت کوشش کی لیکن حد درجہ احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ حدیث کے علاوہ فقہ کی اشاعت میں بھی بے انتہا سعی کی۔ فقہ کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ مساجد کے صحن میں فقہا ایک طرف بیٹھ جاتے تھے اور شائقین نہایت کثرت سے ان کے گرد حلقہ کی صورت میں جمع ہو کر فقہی مسائل پوچھتے جاتے اور وہ جواب دیتے جاتے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تعلیم کا مرتب اور منظم سلسلہ قائم کرنے کے لئے ان فقہا کی بھی تنخواہیں مقرر کر دیں۔ آپ کے زمانہ میں تمام ممالک مفتوحہ میں کم سے کم چار ہزار مسجدیں تیار ہوئیں۔ جن میں امام و موذن مقرر ہوئے اور ان کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ تعلیم بھی دیں۔

تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشاعت تعلیم کے تمام سابقہ انتظامات کو قائم رکھا۔ خصوصاً آپ کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک قرأت اور ایک مصحف پر متحد کرنے کے لئے عہدِ صدیقی کے مدون کئے ہوئے نسخہ قرآن کی نقلیں کرا کر تمام ممالک اسلامیہ

یں بھجوائیں اور اس سلسلے میں بہت سعی بلیغ اور کوشش کی۔ اس سے ساری دنیا کے مسلمانوں کا ایک قرآن پر اتفاق ہوگیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور ان کی اخلاقی اصلاح و تربیت سے خاص شغف تھا۔ اور اس فرض کو مدینہ میں بہ نفسِ نفیس انجام دیتے تھے۔ مسلمانوں کو مذہبی مسائل بتاتے اور ان کو عملی تعلیم دیتے۔ مذہبی علوم میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔

چوتھے خلیفہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بچپن سے دامنِ نبوت میں پرورش اور تعلیم و تربیت پائی تھی اور حضور صلعم کے وصال تک آپ دامنِ نبوت سے وابستہ رہے۔ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد آپ نے علم کی اشاعت میں خاصا حصہ لیا۔ علم فقہ میں تو کوئی آپ کا نظیر نہ تھا۔ آپ حفظ حدیث اور روایت حدیث میں بھی نہایت ممتاز تھے۔ وسعت علم کے ساتھ اسی درجہ کی ذہانت، طباعی اور دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی بھی تھی۔ جماعت صحابہ میں آپ کو امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ حضرت عمرؓ جو خود مجتہد اور امام فقہ تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے استفادہ کرتے تھے۔

تصوف کا سرچشمہ آپ ہی کی ذات گرامی تھی۔ صوفیا کے اکثر بڑے بڑے سلسلے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے آپ ہی پر منتہی ہوتے ہوتے ہیں۔ زبان نبوتؐ سے آپ کو انا مدینۃ العلم و علی بابہا کی سند ملی۔

اندریں حالات ظاہر ہے کہ آپ کے عہد فرخ مہد میں کیسی کچھ تعلیم کی ترقی نہیں ہوئی ہوگی۔

آپ نے دیکھا کہ پورے عہدِ خلافت راشدہ میں ہمارے چاروں خلفانے تعلیم دینی یعنی قرآنی تعلیم کو اولیت کا درجہ دیا اور پورا نظام تعلیم اسی ایک محور پر قائم رہا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خود قرآن کی کیا فضیلت ہے۔ صرف ایک جھلک پیش ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ (ترجمہ)

"درحقیقت آسمان و زمین کی پیدائش میں رات و دن کے ادل بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کو فائدہ پہونچانے والی چیزیں (یعنی مال تجارت) لے کر سمندر میں چلتے ہیں۔ اور بارش میں جس کو خدا آسمانوں سے برساتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کی موت (یعنی بر پڑے رہنے) کے بعد دوبارہ زندہ (یعنی سرسبز و شاداب) کرتا ہے اور ہر قسم کے جانداروں میں جو خدا نے زمین پر پھیلائے ہیں اور ہواؤں کے اِدھر اُدھر پھرنے میں اور ابر میں جو آسمان و زمین کے درمیان گھرا رہتا ہے۔ خدا کے حکم سے (ان سب چیزوں میں) ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس آیت شریف میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے علم کے مختلف شعبوں کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ مثلاً آسمانوں کی تخلیق سے علم ہیئت کی تحصیل مراد ہے۔ زمین کی پیدائش سے علم طبقات الارض و جمادات کی طرف توجہ دینے کی ہدایت ہے۔ شب و روز کے اَدل بَدل سے علم جغرافیہ کی طرف اشارہ ہے۔ جہازوں میں سفر اور اس کے فوائد سے علم جہاز رانی۔ انجنیری و

تجارت و معاش کی ترغیب دی گئی ہے۔ بارش ہونا اور مُردہ زمین کا زندہ ہو جانا۔ موسمیات و زراعت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ جانداروں کے زمین پر پھیلا دینے سے مراد علم حیوانیات کا حصول ہے۔ غرض قرآن میں جابجا عقل کو کام میں لانے اور فکر و تدبر کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے نہایت قلیل مدت میں نہ صرف دریافت شدہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ نہایت کم تعداد اور طاقت سے بڑی سے بڑی تعداد اور زبردست سے زبردست طاقتوں کا مقابلہ کیا، انھیں نہ صرف شکست دے دی بلکہ علم و فن کے میدان میں بھی قلیل ترین مدت میں وہ دنیا کی تمام اقوام سے آگے نکل گئے۔ اور تعلیمی نظریات اور اصول و طرق کے انبار جمع کر دیئے جس کی برکت سے ابن رشد۔ غزالی۔ بوعلی سینا۔ محقق طوسی اور ایسے ہی ہزارہا باکمال پیدا ہو گئے۔ جن کی زلہ ربائی کر کے اہلِ یورپ نے علم و سائنس میں کمال حاصل کیا اور جن کی عظمت کا وہ آج بھی اقرار کرتے ہیں۔ (دسمبر ۱۹۷۰ء)

دو مثالی اُستاد

(۱)

مسٹر ثناء الحق صدیقی
ایم اے۔ بی ٹی۔ بی ایچ (علیگ)

گورنمنٹ سکنڈری اسکول ۲ ناظم آباد میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر ہیں۔ وطن مالوف دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی) تھا۔ صحت حد درجہ خراب ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ سخت محنت اور دل سوزی سے نہ صرف اسکول میں درس دیتے ہیں۔ بلکہ اپنے مکان پر بھی ضرورت مند طلباء کو پڑھاتے ہیں اور کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ یوں تو ان کے بے لوث جذبۂ خدمت کا ہمیں عرصہ سے تجربہ ہے لیکن ابھی حال میں ان کی فراخدلی کا ایک تازہ تجربہ ہوا۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک مبسوط کتاب الموسوم "وادیٔ نیل ــــ تہذیب، تاریخ اور جغرافیہ" شائع کی ہے۔ جس کا تعارف اور آخر کے دو ابواب ہم نے جناب ثناء الحق صاحب سے لکھوائے جو انہوں نے خوب ہی خوب تحریر کئے۔ اس کام کا تین سو پچیس ۳۲۵ روپئے رقم

معاوضہ ہم نے ان کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے نہیں لیا۔ ہر چند اصرار ہوا لیکن بے سود مجبوراً یہ قرار پایا کہ یہ رقم موصوف کی جانب سے کانفرنس کے بلڈنگ فنڈ اور فیس لائف ممبری کی مد میں دے دی جائے۔ فی زمانہ جبکہ ہر چھوٹا بڑا آدمی روپے کے لالچ میں مبتلا ہے اور جائز و ناجائز چھوٹی سے چھوٹی رقم بھی نہیں چھوڑتا۔ جناب ثناء الحق صاحب کے ایثار نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ ثناء الحق صاحب کوئی مالدار آدمی نہیں ہیں۔ اور تھوڑی سی جو آمدنی ہے۔ وہ ان کی ضروریات کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ اس موقع پر یہ ذکر کرنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ثناء الحق صاحب صحیح معنیٰ میں ایک بلند پایہ محقق و ادیب ہیں۔ اُردو۔ انگریزی۔ فارسی اور عربی چاروں زبانوں پر پورا پورا عبور ہے۔ اور جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کو باعتبار زبان و بیان اور معلومات ایک نمونہ کی چیز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ تاریخ۔ جغرافیہ، ادب اور اسلامیات ان کے خاص مضمون ہیں۔ اور ان پر ان کا مطالعہ بیحد وسیع ہے۔ الغرض نہایت قیمتی وجود کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

---

(۲)

سید نجم الحسن زیدی
ایم اے۔ بی ٹی۔ ایل ایل بی (علیگ)

میرے وطن بریلی کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ میں مجھ سے سینیئر مگر ہم عصر تھے۔ یہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک کی بات ہے۔

علی گڑھ ہی میں زیدی صاحب سے ملاقات ہوئی اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مسلم یونیورسٹی جیسی ہائی کلاس تعلیم گاہ میں نجم الحسن صاحب باعتبار معاشرت بالکل درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یونیورسٹی سے دور غالباً مچھلی والوں کی گلی میں ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ جس میں خود اور اپنے دوسرے ضرورت مند عزیز و اقارب طالب علموں کے ساتھ رہتے تھے۔ اوقات تعلیم کے بعد ٹیوشنیں کرتے تھے۔ جن کی آمدنی سے اپنے اور اپنے کمرہ میں رہنے والوں کے جملہ اخراجات کی کفالت کرتے تھے۔ کفایت شعاری کا یہ عالم تھا کہ کسی گہرے رنگ کے کپڑے کے دو جوڑے بنا لئے تھے اور آٹھویں دن انھیں اپنے ہاتھ سے دھو لیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی پیدل آتے جاتے تھے۔

اعلیٰ ترین تعلیمی اسناد کے حصول کے بعد زیدی صاحب کو اس زمانہ میں اچھی سے اچھی ملازمت مل سکتی تھی لیکن انہوں نے خدمت ملک و ملت بالخصوص زبان اُردو کی ترویج و اشاعت کو اپنا لائف مشن بنایا۔ ان کے خیال میں اُردو کا کام کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت بنگال میں تھی۔ چنانچہ سیدھے کلکتہ پہنچے اور پروگرام کے مطابق کام کا آغاز کر دیا۔ فکر معاش سے آزادی حاصل کرنے کے لئے چائے کے ایک سیٹھ کے لڑکے کی ٹیوشن کر لی۔ یہ سیٹھ صاحب نجم الحسن صاحب کے اخلاق و عادات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو صوبہ بہار میں خود ان کی اپنی چائے کی ایجنسی دیدی جس کا کام "زیدی ٹی" کے نام سے ان کے چھوٹے بھائی

مسٹر محمود الحسن بی ایس سی (علیگ) مرحوم کرتے تھے۔ کاروبار کو خوب فروغ ہوا لیکن افسوس کہ یہ کاروبار بہار کے ہولناک زلزلہ کی نذر ہو گیا۔ اس کے بعد بھائی نجم الحسن خالی ہاتھوں بیک بینی و دوگوش دہلی آ گئے۔ اور حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم و مغفور کے اعزازی پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہو کر اردو کی توسیع و اشاعت میں لگ گئے۔ گذر بسر کے لئے ایک چھوٹی سی نوکری بھی کر لی جس کا قصہ اس طرح ہے کہ اینگلو عربک اسکول میں ایک میٹرک پاس ٹیچر کی ضرورت تھی۔ آپ نے صرف میٹرک کی اپنی سند کا حوالہ دے کر درخواست دیدی۔ بی اے یا ایم اے۔ بی ٹی وغیرہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کچھ عرصہ بعد جب ان کی اعلیٰ کارکردگی اور اعلیٰ تعلیمی ڈگریوں کا راز افشا ہوا تو منتظمین اسکول نے ان کی تنخواہ وغیرہ میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا۔

پاکستان بننے کے بعد نجم الحسن صاحب اور ان کے جملہ اہل خاندان کراچی آ گئے۔ خود ان کے اپنے بیوی بچے نہیں تھے۔ کیونکہ سرے سے شادی ہی نہ کی۔ اور آج تک ''ناکتخدا'' ہیں۔ البتہ دوسرے عزیزوں کی خدمت کرنے کے خیال سے گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ .... آگے چل کر ہیڈ ماسٹری کے عہدہ پر بھی فائز کئے گئے اور اسی سے چند سال پہلے ریٹائر ہوئے، جن طلبا، و اساتذہ اور سرکاری افسرانِ تعلیم کا نجم الحسن صاحب سے واسطہ پڑا وہ سب ان کے خلوص، جذبۂ ایثار اور تعلیمی مہارت کے معترف ہیں۔ نجم الحسن صاحب نے رفتہ رفتہ اپنے

اعزا و متعلقین کی رہائش کے لئے لیاقت آباد میں کوارٹر حاصل کئے۔ اور ان کی ہر طرح کی کفالت کی، بچوں کی تعلیم پر خصوصیت سے توجہ کی جس کے نتیجہ میں وہ سب بفضلہٗ زندگی میں کامیاب ہیں۔ خود بھائی نجم الحسن کا حال یہ رہا کہ لباس اور کھانے پینے میں وہی قدیم سادگی قائم رکھی اور اپنے رہنے کے واسطے بھی زیادہ تردّد نہ کیا کہ دن اور رات کے بھی ایک حصہ میں لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے اسکول ہی کی ایک بینچ پر پڑ کر سو جاتے اور صبح کو تازہ دم ہو کر پھر کام پر لگ جاتے۔ کفایت شعاری کی انہیں عمر بھر کی عادت تھی، یہاں کراچی میں ان کو ضرورت سے زیادہ تنخواہ ملنے لگی تو روپیہ بچا کر انہوں نے ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک دو منزلہ کوٹھی تعمیر کی۔ اور اس کو اور اس کے کرایہ کی آمدنی کو "انجمن وظیفۂ سادات" کے نام وقف کر دیا۔

ادھر بہت دنوں سے نجم الحسن صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ غالباً ایک سال پہلے راستہ چلتے مڈبھیڑ ہوئی تھی تو ان کی جیب میں جو ایک روپیہ تھا وہ میں نے کانفرنس کی زیرِ تعمیر بلڈنگ کے لئے چندہ میں لے لیا تھا۔ بہر حال سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی نام و نمود سے دور کچھ نہ کچھ کرتے ضرور ہوں گے۔ یعنی خدمتِ خلق اور تعلیم و تعلّم۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ مردِ آزاد اور قوم کا سچا فدائی تا دیر زندہ و سلامت رہے۔ چاہے ہم سے کبھی ملے یا نہ ملے۔

(سنہ ۱۹۷۱ء)

کالجوں میں داخلہ کا مسئلہ

۱۹۷۱ء میں تیس ہزار چھ سو ستاون میٹرک کے امتحان میں شریک ہونے والے طالب علموں میں سے ۲۲،۳۹۶ کامیاب ہوئے جن میں سے فرسٹ ڈویژن میں ۳۶۵۱ اور سکنڈ ڈویژن میں ۹،۷۸۵ طالب علم پاس ہوئے ان کے علاوہ ۸۸۹۸ یعنی ۲۹ فی صد تھرڈ ڈویژن میں۔ ۶۲ پاس ڈویژن میں اور ۸۳۰۱ فیل ہوئے یا سپلی مینٹری میں آئے۔

چونکہ میٹرک پاس کرنے کے بعد لڑکوں یا لڑکیوں کو عام طور پر کوئی روزگار نہیں ملتا اور ان کے باکار رہنے کا کوئی سلسلہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کی غالب اکثریت کالجوں میں داخلہ لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ شوقیہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت ہی محدود ہوتی ہے۔

کالجوں کی یہ صورت ہے کہ ان میں سے جس قدر اچھی طرح چل رہے ہیں ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ صرف فرسٹ ڈویژن اور سکنڈ ڈویژن کے طالب علموں کو داخل کریں اور بقیہ تھرڈ ڈویژن پاس ڈویژن اور سپلی منٹری میں آنے والے طلباء اور طالبات کو داخلہ

دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔ کہ اعلیٰ ڈویژن نہ پانے والے کیا کریں۔ ان بچوں کی اور ان کے والدین کی پریشانی اس خصوص میں دیکھی نہیں جاتی۔ دن رات خدائی خوار مختلف کالجوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ طرح طرح کی سفارشیں پہنچاتے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی نہ کوئی فوری حل ضرور تلاش کرنا چاہیئے۔ ہمارے وہ کالج جو معیاری سمجھے جاتے ہیں۔ اور جو کسی نہ کسی وجہ سے مشہور ہو گئے ہیں ان کی شہرت کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ اعلیٰ ڈویژن کے امیدواروں کو داخل کرتے ہیں جو خود بخود محنت کر کے انٹر اور بی اے یا بی ایس سی میں بہتر نتائج امتحان بطور تحفہ ان کالجوں کو پیش کر دیتے ہیں۔ اور مذکورہ کالجوں کو بغیر کسی محنت و مشقت کے اچھے نتائج کا مفت کریڈٹ مل جاتا ہے۔ اچھی درسگاہوں کا اصلی کمال یہ ہوتا کہ وہ کم لیاقت کے طلباء کو داخل کرتے اور پھر بہتر نتائج امتحان پیش کرتے۔ حد یہ ہے ڈی۔ جے سائنس کالج کراچی میں فرسٹ ڈویژن کے لئے بھی یہ قید لگا دی گئی ہے کہ امیدوار کے پچھتر فی صدی سے کم نمبر نہ ہوں اور اس طرح کالج مذکور کے اساتذہ کو کم سے کم کام کرنے کی جو سہولت میسر آتی ہے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارا تجربہ اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ اونچی ڈویژن پانے والے طالب علم اپنی کامیابی کے نشہ میں اس قدر

غفلت شعار ہو جاتے ہیں۔ کہ پھر انٹر، بی۔ اے اور بی ایس سی میں ان کی لیاقت گھٹتی چلی جاتی ہے اور میٹرک والی پوزیشن قائم نہیں رہتی۔ برعکس اس کے جو بچے اور بچیاں معمولی ڈویژن سے میٹرک پاس کرتی ہیں ان کو ایک قسم کی یہ ضد ہو جاتی ہے کہ وہ آئندہ امتحانات میں بہتر سے بہتر نتائج دکھا کر اپنی پوزیشن کو استوار کریں۔ احساس کمتری دور کرنے اور حصول برتری کے لئے ان کی جد و جہد دیدنی ہوتی ہے۔

ویسے بھی برصغیر پاک و ہند کے مشہور اور مستند ماہر تعلیم جناب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم و مغفور نے زندگی بھر اس امر کی تبلیغ کی کہ مروجہ امتحانات لیاقت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کرتے چنانچہ زمانہ نے بتایا کہ گھٹیا سے گھٹیا ڈیژنوں میں امتحانات پاس کرنے والے لاتعداد طالب علموں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور زندگی کے ہر شعبہ میں بیش از بیش کامیابیاں حاصل کیں۔ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اسی نظریہ کے پیش نظر اشد ضروری ہے کہ محض میٹرک میں ڈویژن کی پستی کسی طالب علم یا طالبہ کو اچھے کالجوں میں داخلہ دینے میں مانع نہ ہونی چاہیئے۔ اتنا تو ضروری ہونا چاہیئے کہ ہر ایک اونچے سے اونچے کالج کم از کم دس فی صدی سیکنڈ ڈویژن والوں کو اور پندرہ فی صد تھرڈ ڈویژن پانے والوں کو داخلہ دیں تاکہ کم نمبر پانے والوں کی مشکلات دور ہوں اور کالجوں کے اساتذہ کو بھی اپنا جوہر قابلیت دکھانے کا موقع ملے۔ توقع ہے کہ ہمارے ان معروضات پر کالجوں

کے ارباب اختیار ہمدردانہ غور کر کے بلاپس وپیش عمل کریں گے۔
ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن اور بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کو بھی اس اہم قومی ضرورت کے پیشِ نظر جلد از جلد تمام کالجوں کے نام ہدایت نامہ جاری کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ہزاروں طالب علموں کی زندگی کے آئندہ بننے یا بگڑنے کا سوال ہے۔

آخر میں یہ امر بھی لائقِ ذکر ہے کہ قانوناً ہر طالب علم خواہ وہ تھرڈ ڈویژن کا ہو یا سپلیمنٹری کا کسی بھی کالج میں داخلہ لینے کا مجاز ہے۔ لیکن چونکہ پرنسپلوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہیں داخلہ دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں اس لئے قانونی جواز عملاً کالعدم ہو جاتا ہے۔ فروغِ تعلیم کے لئے اس قانونی تضاد کا دور ہونا ازبس ضروری ہے۔

(دسمبر ۱۹۷۱ء)

جدید تعلیمی اسکیم

انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر ایک شعبہ مسئلۂ تعلیم سے مربوط ہے۔ مثلاً دیہات میں بسنے والے ۸۰ فیصدی پاکستانیوں کی معیشت درست ہو جائے اور مالی حالت بہتر ہو جائے تو وہ پہلا کام یہ کریں گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں گے۔ اسی طرح دوسرے پیشوں، صنعت، تجارت، عام دستکاری اور مختلف النوع ملازمتوں میں مصروف لوگوں کا حال ہے کہ اگر ان کو زیادہ یافت ہو گی تو وہ اپنے بچوں کو ہرگز تعلیم سے محروم نہ رکھیں گے۔ کیونکہ اس بات کو ہر شخص سمجھتا ہے کہ تعلیم ہی ترقی کا زینہ اور خوشحالی و مرفہ الحالی کی ضامن ہوتی ہے۔

اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہمارے ملک کی موجودہ انقلابی حکومت نے جو صنعتی انقلاب برپا کیا ہے۔ لیبر قوانین کی اصلاح کی ہے۔ زمینداری و جاگیرداری کا خاتمہ کیا ہے اور ملازمتوں کی تطہیر کی ہے۔ ان سب اقدامات کا فائدہ مسئلہ تعلیم کو پہنچے گا۔ علاوہ بریں حکومت نے براہ راست تعلیمی اصلاح کا بھی بیڑا اٹھایا ہے اور ایک نہایت جامع

پالیسی تیار کرکے اس کے نفاذ کے متعلق احکامات جاری کئے ہیں۔

جدید تعلیمی اسکیم سے متعلق دو امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اولاً حکومت تعلیمی ترقی اور اصلاح سے متعلق نہایت اولوالعزمانہ پیشکش اور وعدے کررہی ہے تو ہمیں ہرگز یہ نہ کہنا چاہیئے کہ حکومت یہ نہ کرسکے گی۔ وہ نہ کرسکے گی۔ حکومت کے وسائل بے پناہ ہوتے ہیں۔ پرائیویٹ وسائل اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ویسے بھی ہم ہمیشہ حکومت سے یہ مطالبہ کرتے چلے آئے ہیں کہ تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اس کو قبول کرنی چاہیئے۔ سابقہ حکومتوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلوتہی کی۔ موجودہ حکومت اس کے برعکس بھرپور طریقہ پر ہر طرح کی ذمہ داری لینے کو تیار ہے جس کا ہمیں پُرجوش خیرمقدم کرنا چاہیئے اور بلاپس وپیش تعاون کرنا چاہیئے۔ (اپریل ۱۹۷۲ء)

"تعلیمی ترقّی کے لئے لسانی اتحاد ضروری ہے"

"دنیا کے مختلف ممالک کو باعتبار خواندگی دس گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے اعلیٰ گروپ میں وہ ملک آتے ہیں جن میں خواندگی ۷۵ سے سو فیصدی تک اور سب سے پست درجہ کا وہ گروپ ہے جس میں کم و بیش دس فیصدی خواندگی والے ملک شامل ہیں۔ پاکستان کا تعلق آخری گروپ سے ہے جس کی خواندگی کا تناسب ۱۵ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ کراچی چونکہ ایک صنعتی اور تجارتی مرکز ہے۔ اور برصغیر پاک و ہند کے ترقی یافتہ لوگ بہت بڑی تعداد میں یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس شہر میں خواندگی کا تناسب البتہ ۳۵ فی صدی ہے۔

پاکستان میں زیر تعلیم طلباء اور طالبات کا دوسرے ممالک کے مقابلہ میں تقابلی مطالعہ حسب ذیل ہے۔

ثانوی و انٹرمیجٹ ایجوکیشن ایج (A GE) گروپ

امریکہ ۱۰۰ فی صد روس ۶۷ فی صد ایران ۲۱ فی صد

جاپان	۸۶ فی صد	مصر	۳۸ فی صد	ہندوستان	۱۵ فی صد
انگلستان	۷۲ "	ترکی	۲۴ "	پاکستان	۸ "

اعلیٰ اور یونیورسٹی ایجوکیشن ایج (AGE) گروپ کے زیرِ تعلیم لوگوں کا تناسب

امریکہ	۵۰ فی صد	جاپان	۲۵ فی صد	پاکستان	۲ فی صد

ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم والوں کا فی لاکھ دوسرے ممالک سے مقابلہ درج ذیل ہے۔

امریکہ	۳و۷۰۰ فی لاکھ	روس	۹۰۰ و ۱ فی لاکھ	پاکستان	۱۷۵ فی لاکھ
کنیڈا	۲و۴۰۰ "	ہندوستان	۲۱۷ "		

ابتدائی تعلیم کے زیرِ تعلیم لڑکے ۱۹۷۲ء میں ۳۵,۰۰,۰۰۰

" " " لڑکیاں " " ۲و۰۵۰۰۰

حکومت پاکستان نے جدید تعلیمی پالیسی کا جو منصوبہ پیش کیا ہے۔ اس پر اگر عمل درآمد ہو سکا تو ۱۹۸۰ء تک مختلف درجات کی تعلیم پندرہ فیصد تک ہو جائے گی۔

۱۹۷۱-۷۲ء تک تعلیم پر مختلف ممالک میں ان کے قومی بجٹ میں تعلیم پر خرچ کا فیصدی اوسط درج ذیل رہا۔

کنیڈا	۸و۳ فی صد	روس	۷و۳ فی صد	مصر	۵ فی صد
ممالک یورپ	۷و۶ فی صد	جاپان	۶ "	پاکستان	۲ " سے کم

اب تک ہم ستر کروڑ روپیہ سالانہ تعلیم پر خرچ کرتے رہے ہیں۔ نئی تعلیمی اسکیم کے تحت اس خرچ کو بڑھا کر ایک ارب بیس کروڑ تجویز کیا گیا ہے اور اگر سال بسال تعلیم کی مد میں زیادہ روپیہ بجٹ میں رکھا جاتا رہا تو سنہ ۱۹۸۰ء تک ہمارے تعلیمی اخراجات کا تناسب ۴ فیصدی ہو جائے گا۔ جو سنہ ۷۲-۱۹۷۱ء آج کے مصر سے بھی کم ہوگا۔

مندرجۂ بالا اعداد وشمار سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا ملک پاکستان تعلیمی دوڑ میں کس قدر پسماندہ ہے اور دوسرے اوسط درجہ کے ترقی یافتہ ممالک کے برابر آنے کے لئے بھی کس قدر صرفِ زر اور محنت و کوشش کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری تمام تر انفرادی اور اجتماعی توانائیاں فروعی جھگڑوں اور اختلافات میں صرف ہو جاتی ہیں۔ اور تعلیم جو زندگی کے ہر میدان میں ترقی و نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ وہ یکسر نظر انداز ہے۔ حصولِ آزادی سے پہلے ہم غیر ملکی حکمرانوں اور غیر مسلم اکثریت کو الزام دیتے تھے کہ وہ ہمیں مہذب اور تعلیم یافتہ بنانا نہیں چاہتے لیکن اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد ہماری تعلیمی پسماندگی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

تعلیمی ترقی میں بظاہر جو رکاوٹیں ہیں ان میں سے

(۱) ملک اور عوام کا عام افلاس ہے ـــــ بلا استثنا ہر شخص اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتا ہے مگر نہیں دلا سکتا۔

(۲) ملک میں آئے دن سیاسی خلفشار کا رونما ہونا جس کے باعث اطمینان و سکون مفقود ہو چکا ہے۔ اور یکسوئی خاطر کے ساتھ تعلیمی کام کرنے کا میدان دن بدن محدود سے محدود تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

(۳) زبان کا مسئلہ کہ کس زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے کہ بچّے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہو۔ بچے کو اس قدرتی حق سے محروم کرنا ایک بہت بڑا انسانی المیہ ہے اور ہر شخص کی ہمدردی کا مستحق ہے۔ جب بچّے کو اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا آجائے اور اس کے دماغ کی بند کھڑکی کھل کر اس میں علم کی شمع روشن ہو جائے تو اس کے بعد تعلیم کی اگلی منزلوں میں قومی مفاد اور ملکی یک جہتی کے پیش نظر ضروری ہے کہ اس کے لئے ملک کی قومی زبان کا سیکھنا لازمی کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ملک مختلف علاقائی حصوں میں بٹ جائے گا۔ اور ملی اتحاد ناپید ہو جائے گا۔ لیکن اس نظریہ کو رواج عام دینے کے لئے کسی بھی زبان کو زبردستی افرادِ ملت پر ٹھونسا نہ جائے بلکہ مطلب براری کے لئے افہام و تفہیم سے کام لے کر اس نظریہ کی پُر سکون طریقہ پر تبلیغ کی جائے۔

جن جن علاقوں میں پورے ملک کی قومی زبان مادری زبان نہیں ہے تو ان لوگوں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے جن کی قومی اور مادری زبان ایک ہی ہے ان کے لئے علاقائی زبان کا

سیکھنا اور سمجھنا اشد ضروری ہے۔ تاکہ وہ مذکرہ علاقوں میں علاقائی زبانوں میں گفتگو کرکے ہی قومی زبان کی اہمیت و افادیت واضح کرسکیں۔ اس خصوص میں ہمیں زمانۂ قدیم کے ان مبلغینِ اسلام کے طرزِ عمل کی تقلید کرنی چاہیئے جن کی اس برصغیر میں آنے سے پہلے اپنی زبان عربی و فارسی یا ترکی تھی لیکن تبلیغ اسلام کے لئے وہ جن جن علاقوں میں گئے وہاں کی علاقائی زبانوں کو انہوں نے پہلے سیکھا اور مہارت حاصل کی تاکہ جن لوگوں میں کام کرنا تھا۔ ان کو اُن کی زبان میں اپنے مطلب کی بات سمجھا سکیں۔ لاہور میں حضرت داتا گنج بخشؒ اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سلہٹ میں حضرت جلال باباؒ اور مثل ان کے لکھوکھا بزرگوں نے اسی پر عمل کیا۔ اور مقامی آبادیوں کو اپنا معتقد و گرویدہ بنایا۔ یہ بات ہرگز نہیں چلے گی کہ دوسرے لوگ آپ کی زبان سیکھیں اور آپ ان کی مادری زبان سے بیگانہ رہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل برصغیر پاک و ہند میں ایک تعلیمی اور قومی لیڈرشپ ہوا کرتی تھی اور یہ لیڈرشپ وزارتوں یا دوسرے اعلیٰ مناصب کی محتاج نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے رہنما شب و روز قومی صلاح و فلاح کے کاموں میں منہمک رہتے تھے۔ اس کے لئے ملک کے طول و عرض میں مسلسل اور طویل دورے کرتے تھے۔ بالخصوص ہر چھوٹی بڑی تعلیم گاہ میں جاکر مفید موضوعات پر تقریریں کرتے تھے۔

مقامی کارکنوں سے میل جول بڑھاتے تھے۔ اور اُن کے کاموں میں جو اُلجھنیں ہوتی تھیں ان کو دور کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اس قسم کی لیڈر شپ مفقود ہو گئی جس کو حلِ مسائل کے لئے از سرِ نو پیدا کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ (جون ۱۹۷۲ء)

سیاسیات

پاکستان کا نظریاتی پس منظر[1]

برصغیر پاک و ہند بیرونی حملہ آوروں کا متواتر آماجگاہ رہا ہے۔ اس کی ابتدا آریوں کے اس ملک میں بتدریج داخلے سے ہوتی ہے۔ آریوں نے یا تو اس سرزمین کے قدیم باشندوں کو جنگلوں اور پہاڑوں میں ڈھکیل دیا یا انھیں اپنا خدمت گار بنا لیا۔ جن لوگوں کو انھوں نے اپنا خادم بنایا اُنھیں ذات پات کے ظالمانہ شکنجوں میں اس طرح جکڑا کہ وہ اُس ذلیل حالت سے نکلنے اور اپنے آقاؤں کی خدمت سے روگردانی کرنے کا تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے۔ ذات پات کے ظالمانہ قواعد کا آہنی پنجہ اتنا طاقتور ثابت ہوا کہ تین ہزار سال گزرنے کے بعد بھی وہ لوگ اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے پورے طور پر آزاد کرنے کے قابل نہ بن سکے۔ حالانکہ زمانے نے ایسے ہندو مصلحین بھی پیدا کیے جو سماجی عدل و انصاف اور عام مساوات کے حامی تھے اور ذات پات کے مذکورہ قواعد کے خلاف پرچار کرتے تھے۔

اس کے بعد جو حملے باہر سے ہوئے اُن کی عموماً یہ کیفیت رہی کہ حملہ آوروں کے پہاڑوں۔ وادیوں اور میدانوں میں پھیل جانے کے بعد اُن کا جوش ٹھنڈا اور قوّت زائل ہو گئی۔ اور چونکہ ان بیرونی حملہ آوروں

---

[1] یہ مقالہ بین الاقوامی ہسٹری کانفرنس میں بزبان انگریزی ۴ر فروری ۱۹۶۲ء کو کرزن ہال ڈھاکہ میں پڑھا گیا۔

کی تعداد مقابلتاً بہت کم ہوتی تھی اس لئے وہ ہندو اکثریت کے سمندر کا لقمہ بن جاتے تھے اور برہمن ازم کے اندر مکمل طور پر جذب ہو جانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ اُن کی امتیازی خصوصیات اور جُداگانہ قومیت کا شائبہ بھی اُن کے اندر باقی نہ رہتا تھا۔ اس طرح آریہ اکثریت کے لئے ان کا وجود کوئی سماجی۔ سیاسی یا قومی مسئلہ پیدا نہ کرتا۔ ہندو سماجی نظام میں اتنی لوچ اور لچک تھی کہ یہ باہر سے آئے نوآباد لوگ زیادہ عرصہ تک اُس نظام سے باہر نہ رہ سکتے تھے۔

لیکن مسلم فاتحین کا معاملہ جو شمال مغربی سرحدّی دروں کے پُرانے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اس سے مختلف تھا۔ یہ نووارد خود اپنا ایک جاندار سماجی، مذہبی اور ثقافتی نظام رکھتے تھے اور اس یقین میں سرشار تھے کہ وہ اعلےٰ اور فضل ہے، ان میں یہ جوش اور جذبہ بھی تھا کہ اپنے بہتر تصوّرِ حیات کو ہر جگہ جہاں جائیں لوگوں میں پھیلائیں بلکہ وہ اس کی اشاعت کے لئے میدان اور مواقع تلاش کرنے کو اپنا ایک فریضہ سمجھتے تھے، ایسے لوگوں کے لئے، ہندوؤں کا فرسودہ سماجی نظام۔ ان کا مشرکانہ طریقۂ پرستش، پروہت پرستی اور ذات پات کے جنگل میں پھنسا ہوا معاشرہ کوئی کشش نہ رکھ سکتا تھا۔ ذبیحۂ گاؤ پر مسلمانوں کے اصرار اور بُت پرستی سے اُن کی نفرت نے فاتحین اور مفتوحین کے درمیان اختلاف کی ایسی خلیج حائل کردی جو ناقابلِ عبور ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم معاشرہ اپنی امتیازی شکل میں یہاں قائم رہا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً ثقافتی یکسانیت پیدا کرنے کی کوششیں

کی جاتی رہیں اور وہ جزوی طور پر کامیاب بھی ہوئیں لیکن انجام کار مذکورہ اختلافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب اکثریت رکھنے والی قوم کے تعصب کے بے پناہ سیلاب سے ایک نازک موقع پر مسلمانوں کو اپنے صدیوں پرانے قومی اور مذہبی تصورات جن کی وہ دل سے قدر کرتے تھے غارت ہوتے نظر آئے تو انھوں نے ایک علیحدہ خطۂ ملک حاصل کر کے اُسے اپنا وطن بنا لیا۔ مذکورہ روداد سے ظاہر ہے کہ آرین سیاست دانوں اور حکمرانوں کے لیے مسلمانوں کا وجود ہمیشہ ایک دشوار مسئلہ بنا رہا جس کو حل کرنے کے لیے مختلف زمانوں میں انھوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق مختلف تدبیریں اختیار کیں ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں سراسر غلط ہے۔

ہندوستان پر مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ اقتدار جو کبھی کافی زبردست اور کبھی کمزور رہا اس بلند بانگ دعوے کی مستقل طور پر تغلیط و تردید کرتا ہے کہ یہ ملک جو ذات پات، مذہب، زبان، جغرافیائی حالت اور قومی آرزوؤں کے اختلافات کے باعث ہمیشہ منقسم رہا ہے ایک واحد قوم کا وطن ہے اور اس کی حدود میں ہمیشہ ایک ہی قوم نے نشو و نما پائی ہے اور دو قومی نظریہ اُس کی تاریخ اور روایات کے منافی ہے۔

جہاں تک مسلم حکمرانوں کا تعلق ہے وہ اس ملک سے اور اُس کے قومی تصورات سے اپنی اپنائیت کا ہمیشہ مظاہرہ کرتے رہے۔ اول انھوں نے اسے اپنی پسند کا ملک سمجھا اور بعد ازاں وہ اسے ہی اپنا وطن سمجھنے لگے۔ وہ یہاں بس گئے، اور یہاں کے باشندوں سے یگانگت اور یکجہتی

پیدا کرلی اور اُن کی خوشحالی اور بدحالی میں پورے طور پر اُن کے شریکِ حال بن گئے۔ اُنھوں نے محنت اور سرفروشی سے کمائی ہوئی اپنی دولت اس ملک کی اور اس کے باشندوں کی فلاح وبہبود اور ترقی پر صرف کی۔

دہلی یا صوبائی حکومتوں کے چند بدنام حکمرانوں کے کردار اور حکمتِ عملی کو مورخین خواہ کیسے ہی بھیانک رنگ میں پیش کریں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شہری حقوق یا مذہبی رواداری کے معاملے میں یہاں کے اکثریتی فرقے کے خلاف کسی قسم کا نقصان رساں امتیاز ایسے طریقہ پر نہیں برتا جاتا تھا جیسا کہ اُس زمانہ میں یورپ کے ممالک اسپین، فرانس، انگلینڈ اور جرمنی میں اختیار کیا جاتا تھا۔ متعصب مورخین نے مُسلم حکمرانوں پر سخت ترین نکتہ چینی کی ہے لیکن بدترین مسلم حکمرانوں پر کبھی اُن مورخین نے یہ الزام نہیں لگایا کہ اُنھوں نے کبھی اپنی رعایا کے قتل وغارت کی اجازت دی یا بزور اُنھیں اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ روزگار اور سرکاری سرپرستی کے یا آزادیِ ضمیر اور عبادت کے دروازے اُن پر بند کئے۔ بعض صوبائی حکومتوں اور جاگیروں میں تو غیرمسلموں کی خوش حالی اور مراعات مسلمانوں کے لئے بھی قابلِ رشک تھیں۔

لیکن اکثریتی فرقہ یہ نہ بھولا کہ مسلمانوں نے جواب غیرملکی نہ رہے تھے اُن تمام کوششوں کو جو مسلمانوں کو ہندو برادری میں شامل کرنے اور ان کا نسلی اور قومی امتیاز ختم کرنے کے لئے اُن کی جانب سے کی گئی تھیں ناکامیاب بنادیا تھا۔ اس بنیاد پر وہ مسلمانوں کو ملیچھ (ناپاک) ہی سمجھتے رہے۔ اور ہمیشہ

ایسے مواقع کی تاک میں رہتے تھے کہ اُن کے خلاف سیاسی بحران، فسادات اور مسلح بغاوتیں برپا کر سکیں۔ اس کے علاوہ خفیہ ساز باز اور سیاسی چالبازیوں سے ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کے جتن کرتے رہتے تھے اور اس طرح کے مواقع انھیں اکثر ملتے تھے کیونکہ مسلمان حکمرانوں اور سرداروں کی پرائیویٹ مجالس تک میں انھیں باریابی حاصل تھی، بلکہ بعض حکمران انھیں اپنا عزیز ترین دوست سمجھنے لگتے تھے۔

دراصل مسلمان فاتحین نے اپنے مذہبی اصولوں کے پیشِ نظر خصوصاً اپنے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی احادیث اور اُن کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں نیز سیاسی حالات کے تقاضوں کے مطابق ہندوؤں سے مذہبی رواداری اور سماجی میل جول کا سلوک سرکاری اور شخصی دونوں سطحوں پر روا رکھا اور ایسا کرنے میں وہ وقتی سیاسی مقتضیات کے حدود سے تجاوز کرنے کے بھی مرتکب ہوئے۔ ایک ایسی قوم کے درمیان جو ہر بات میں اُن سے مختلف تھی قلیل ترین اقلیت ہونے کے پیشِ نظر مسلم حکمرانوں کے لئے ازبس ضروری تھا کہ اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے وہ ایک حد تک امتیازی علیحدگی قائم رکھتے۔ ہندوؤں نے اس فراخدلانہ رویہ سے بیجا فائدہ اُٹھایا۔ انھوں نے اپنی کثیر دولت کے ذریعہ دہلی کے شاہی دربار نیز صوبائی درباروں میں بہت زبردست اثر ورسوخ قائم کرلیا۔ اس دہرے حملے کا تباہ کن اثر بالآخر مسلمانوں کو محسوس ہونے لگا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے مذکورہ دو طریقوں کے علاوہ ایک تیسرا محاذ بھی تیار کیا۔ یہ مسلمانوں کی

مذہبی اور روحانی سالمیت کے خلاف تھا۔ اور اس لحاظ سے پہلے دونوں نظریوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ اس محاذ کی تیاری میں ہندو عقلا اور روحانی پیشواؤں کا بڑا حصہ تھا۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں پر اُن کے مذہب کا بڑا غلبہ ہے اور اسی بنیاد پر اُن میں یکجہتی ہے۔ لہذا انھوں نے بھگتی جیسی تحریکیں شروع کیں۔ علاوہ ازیں لسانی اور ثقافتی تحریکات کو بھی جنم دیا۔ چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں یہ تحریکیں وجود میں آئیں۔ ان سب کا اصل مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کے دینی عقائد کو کمزور یا فنا کیا جائے۔ بھگتی تحریک مسلمانوں کے عقائد کمزور کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوئی لیکن ہندوؤں کی تنگ نظری، اور قدامت پسندی پر اس تحریک کا بھی قطعی اثر نہ ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سترھویں صدی میں ہندوؤں نے اپنے قدیم دھرم کو زندہ کرنے کے لئے زبردست تحریک چلائی جس نے سیواجی کی قیادت میں مسلمانوں کے خلاف جارحانہ صورت اختیار کرلی۔ اس تحریک نے اکثریتی فرقے کے لوگوں کو اپنے مسلمان حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنے کی دعوت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے اور آزاد صوبوں کے فراخ دل اور صلح پسند مسلم حکمرانوں نے اس ملک میں یگانگت اور صلح پسندی کی جو فضا پیدا کی تھی وہ تقریباً ختم ہوگئی اور یک قومی نظریہ کا ابطال مکمل ہوگیا۔

ہندوؤں کی جارحانہ تحریکوں کا ردّ عمل مسلمانوں میں رونما ہونا لازمی تھا چنانچہ اہلِ نظر علما اور مشائخ نے اسلام کے دشمنوں کی اُن خطرناک کارروائیوں کو سمجھ لیا جو اصل اسلام کو بے جان یا کمزور کرنے کے لئے وہ کر رہے تھے اور مسلم عوام کو اس خطرہ سے آگاہ کرنے کی جدوجہد

شروع کر دی۔ اگرچہ درباری علماء اس وقت اپنے آقاؤں کی ہدایت کے مطابق جن کے اسلامی عقائد عموماً گمراہ ہو گئے تھے خاموش رہے لیکن ملک کے دیگر جرأت مند علماء نے مسلم حکمرانوں کی بدعتوں کے خلاف زبردست آواز اٹھائی۔ ایسے علماء میں سب سے زیادہ زوردار اور موثر آواز حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی کی تھی جنھوں نے شاہی عتاب اور تعزیر کی پروانہ کرتے ہوئے مذہب سے متعلق غلط شاہی اقدامات کے مضر اثرات کو دور کرنے کی علانیہ کوشش شروع کر دی۔ انھوں نے حق و صداقت کی ایسی مشعل روشن کی جس سے دوسروں کو صحیح راہ اختیار کرنے میں بڑی مدد ملی۔

ایک دوسرے نازک موقع پر جب مسلم سلطنت، مسلم معاشرہ اور مسلمانوں کی ہر چیز کے قطعی طور پر نیست و نابود ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے مسلم شیخ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی دشمنوں کی زبردست فوجوں سے مسلمانوں کو بچانے اور اسلام کا تحفظ کرنے کے لئے میدانِ عمل میں آئے۔ اُن کی روحانی کشش اور وسیع اثرات کی بدولت کئی مسلمان حکمران جن کے پاس فوجی طاقت موجود تھی ان کی خواہش کے مطابق باہم مل کر دشمنوں کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے اور اس اتفاق اور ہم آہنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف مرہٹہ طاقتوں اور دیگر مسلمان دشمن عناصر کا جو وفاق وجود میں آیا تھا احمد شاہ ابدالی، نجیب الدولہ، حافظ رحمت خان اور دیگر مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں مکمل شکست کھا کر تہ و بالا ہو گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقصد اسلام کو فروغ دینا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے

جو منصوبہ انھوں نے بنایا تھا اس کا سلسلہ اُن کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ اُن کے جانشینوں اور شاگردوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور آگے بڑھایا۔ وہ چاہتے تھے کہ زوال پذیر مغل بادشاہت کی خاکستر سے ایک طاقتور مسلم سلطنت تعمیر کی جائے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ریاضت، محنت، اور جہاد بالسیف کو اپنا مسلک بنایا لیکن ۱۸۵۷ء کی ہولناک تباہی نے اُن کے اس خواب کو پاش پاش کر دیا۔ اب مسلمانوں کو اپنے تحفظ اور ملک میں عزت کے ساتھ رہنے کے لیے دوسرے قسم کی جد و جہد کی ضرورت تھی جس کے لیے قدرت نے سرسیّد احمد خاں کو منتخب کیا۔ اُن کی رہبری میں علی گڑھ میں عقل و دانش کا مرکز قائم ہوا۔ اسی مرکز میں مُسلمانوں کے سیاسی تصورات نے مقتضائے وقت کے مطابق نشو و نما پائی۔ ہندوستان میں نام نہاد قومی تحریک شروع ہونے کے بعد سے جو سیاسی ہنگامہ آرائیاں وجود میں آئیں اُن سے تمام صاحب فکر و نظر مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ایک مجنونانہ حد تک متعصب اکثریت اور ایک پس ماندہ اقلیت کا ایک ملک میں باہم مل کر حکومت کا کاروبار چلانا ناممکن نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ خطۂ ملک حاصل کرنے اور اُسے اپنا وطن بنانے کا تصور لوگوں کے ذہن میں آیا تا کہ وہ اپنے پسندیدہ مذہبی و ثقافتی تصورات کی روشنی میں اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔ چودھری رحمت علی نے اس خطۂ ملک کا نام پاکستان تجویز کیا اور علامہ ڈاکٹر اقبال نے پاکستان کے مطالبہ پر مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ

الہ آباد میں جس کے وہ صدر رہتے "پاکستان" کا متعین تصور پیش کیا بعد ازاں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے جنھیں انڈین نیشنل کانگریس کے نیتاؤں کی ہٹ دھرمیوں سے سخت صدمہ پہونچ چکا تھا پاکستان کے مطالبہ کی پورے جوش اور یقین محکم سے پیدا شدہ قوتِ ارادی کے ساتھ حمایت کی۔ حکومت برطانیہ اور انڈین نیشنل کانگریس نے اپنی پوری قوت سے اس کی مخالفت شروع کردی لیکن چونکہ تحریکِ پاکستان محض موجودہ دور کے سیاسی قائدین کا ایجاد کردہ ایک حربہ نہ تھی بلکہ اس کی بنیاد اُن نظریوں پر تھی جنہیں صدیوں سے مسلم مفکرین اور مصلحین اپنے دل و دماغ میں پرورش کرتے رہے تھے اسلئے اس تحریک کے مخالفین باوجود اپنی زبردست مادی قوتوں کے اسے دبا نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ تمام مسلمان جو کانگریس میں شامل تھے اور نظریۂ پاکستان کی شدید مخالفت کرتے تھے تحریکِ پاکستان کے حامی بن گئے ١٩٤٧ء میں پاکستان بالآخر وجود میں آگیا اور اب ہر اعتبار سے یہ یقین واثق ہے کہ دنیا کے نقشہ پر وہ مستقلاً موجود رہے گا۔ لیکن پاکستان کا مستقبل یقیناً اُس کے باشندوں کے نظریۂ پاکستان سے وابستہ رہنے اور اس پر کامل یقین رکھنے پر منحصر رہے گا۔ یہ نظریہ فروغِ اسلام کے نظریہ سے ہم آہنگ ہے اس لئے ہمیں اس کی پرورش اور تقویت کیلئے اس سے اخذ کردہ تمام اصولوں پر صوری اور معنوی ہر اعتبار سے کاربند رہنا لازمی ہے۔

ساتھ ہی ہمیں اپنے اُن کروڑوں مسلمان بھائیوں کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے جو قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں برابر کے شریک تھے اور اب وہ ہندوستان میں عہدِ انگریزی سے بھی زیادہ سخت غلامی کے مصائب کا شکار ہیں۔ ایک مضبوط اور متحدہ پاکستان کی خیر سگالی ہی اُن کے تحفظ و صیانت کی بہترین ضمانت ہوسکتی ہے۔

(فروری ١٩٦٢ء)

سابق سیاست کار کیا کریں؟

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

دُنیا کی کسی بھی حکومت سے سب لوگ خوش نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ ہر حکومت کو سزا اور جزا دونوں کا اختیار ہوتا ہے۔ جو طبقہ سزاوارِ جزا ہوتا ہے وہ حکومت کے گُن گاتا ہے اور جو مستوجب سزا ہوتا ہے وہ بُرا بھلا کہتا ہے۔ آخرالذکر طبقہ خود اپنی کوتاہیوں کا کبھی محاسبہ نہیں کرتا بلکہ دوسروں ہی کی بدگوئی میں لگا رہتا ہے۔

اگر یہ عیب جوئی اور نکتہ چینی مبنی بر انصاف ہو اور اس کی بُنیاد ذاتی نفع و نقصان پر نہ ہو تو اس کو مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے لیکن معزز مستثنیات سے قطع نظر کر کے آپ جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ہر شخص کی ایک قیمت ہے۔ کسی کی کم، کسی کی زیادہ۔ جونہی وہ قیمت وصول ہو گئی، نکتہ چینی مداحی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آج کے کاسہ لیس جونہی نفع اندوری کی پوزیشن سے محروم ہوتے ہیں مخالفین کی صف میں نظر آنے لگتے ہیں۔ یا کم از کم حکومت اور ملک و قوم سے بیزار ہو کر اُس وقت تک کے لئے گوشہ نشین ہو جاتے ہیں جب تک کہ پھر کبھی بمساعدِ زمانہ صاحبانِ اقتدار میں سے کسی کی نظر کیمیا اثر اُن پر پڑ جائے۔

افرادِ ملت کی اس ذہنیت اور کردار نے اُن کو بالکل فٹبال بنا دیا ہے۔

ان کے وجود کی کوئی اپنی انفرادیت اور افادیت باقی نہیں رہی ہے۔ پاکستان کی تیرہ کروڑ آبادی میں صدر مملکت۔ اور دوسرے صاحبانِ اقتدار ایک محدود تعداد ہی میں ہوسکتے ہیں۔ باقی لوگ جو اِن ذمہ دار حیثیتوں سے محروم ہیں وہ شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے شب و روز غم و غصے میں گذار رہے ہیں۔ ہمیں ان اصحاب سے دلی ہمدردی ہے۔ کاش! ہم انھیں بتا سکتے کہ زمانۂ اقتدار میں ان کو جو عزت اور مسرتیں حاصل تھیں وہ اقتدار کے عدمِ حصول یا اس سے محرومی کے بعد انھیں کس طرح نصیب ہوسکتی ہیں؟

سابق وزیروں۔ سابق ممبرانِ اسمبلی۔ سابق میونسپل کونسلروں کی تعداد کافی بڑی ہوچکی ہے اور آئندہ اس تعداد میں مزید اضافہ ہوگا۔ کل تک یہ لوگ محبوب خلائق اور حکامِ عالی مقام کی نگاہ میں قابلِ احترام تھے آج یہ حال ہے کہ۔ ع اکیلے پھر رہے ہیں یوسفِ بے کارواں ہوکر

جو شخص بھی عام انسانوں سے ابھر کر کوئی نمایاں مقام حاصل کرتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ خداداد اعلیٰ صلاحیتوں کا ضرور مالک ہوتا ہے۔ ان صلاحیتوں کا بے مصرف رہنا ایک بہت بڑا قومی ضیاع ہے۔ ہم نے بکثرت ذہین طباع خوب پڑھے لکھے اور بہترین مقررین کو دیکھا ہے کہ اگر وہ بخت و اتفاق سے الیکشن میں ہار گئے تو وہ سب بے وقوفوں کے بے وقوف بن کر رہ جاتے ہیں۔

حکومت و اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ ماضی کے با اختیار۔ حال کے بے اختیار اور حال کے با اقتدار مستقبل کے بے اقتدار ہو جائیں گے۔ یہ کلیہ اگر ایک طرف اس وقت کے صاحبانِ مجاز کے لئے سبق آموز ہے تو دوسری طرف

محرومانِ اختیار کے واسطے وجہ تسکین بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی اولوالعزم قومی کارکن پانچ سال کسی اسمبلی کا ممبر رہا تو اونچی سے اونچی سوسائٹی میں اس کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کیا جاتا تھا۔ کوئی سی چھوٹی بڑی سرکاری اور غیر سرکاری دعوت و تقریب ایسی نہ ہوتی جس میں اُس کی شرکت ناگزیر نہ سمجھی جاتی ہو۔ اس کی رائے اور تقاریر کی دھوم تھی گویا کہ۔ ؏

مستند تھا اُس کا فرمایا ہوا

لیکن اگر کسی وجہ سے وہ اعزاز و اقتدار سے محروم ہو گیا تو ایک دم کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ کوئی دو کوڑی کو نہیں پوچھتا۔ ؏

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

ساری صلاحیتیں بے کار اور جملہ کمالات بے حقیقت کیونکہ اب وہ صرف سابق فلاں ہے اور اُس جیسے لوگوں کا ہمارے معاشرہ میں کوئی مقام نہیں ہوتا۔ زندگی میں اس عظیم انقلاب سے یا تو ہیچ میرزی کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے اور آدمی اپنے آپ کو بیکار و معطل کر لیتا ہے اور یا وہ انتقاماً فتنہ پردازی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔ اور اس کا وجود ملک و ملّت اور حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ بن جاتا ہے۔ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے ہی تدبر و سیاست کا اقتضا ہوتا ہے کہ سیاست کاروں اور سیاست دانوں کی تعداد کو بڑھنے نہ دیا جائے۔ ساتھ کے ساتھ سابق میں حکومت و اقتدار کے حامل اصحاب سے ہماری دردمندانہ گذارش ہے کہ وہ کچھ ایسے متبادل مشاغل اپنے واسطے پیدا کریں جن کے ذریعہ ان کی باکاری قائم رہے اور ان کے

اوقاتِ عزیز پہلے سے بھی بہتر تعمیرِ ملی کے کاموں میں صرف ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر صاحبِ اقتدار کا زمانۂ عروج محدود ہوتا ہے اور اس کا جلد یا بدیر خاتمہ ضرور ہوتا ہے، یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ ؏

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی

اور پھر آخر میں ہر کسی کو وہ منزل بھی پیش آنی ہے کہ۔ ؏

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارہ

بڑے بڑے شہسوارانِ عرصۂ سیاست و حکومت اپنا اپنا دور ختم کر کے اور "خارج از تصویر" ہو کر جلسہ و جلوس سے بے تعلق ہو چکے ہیں۔ ہاں! ان کے نیک کام البتہ ناقابلِ فراموش رہیں گے۔

بقائے دوام کے لئے صرف سیاسی میدان کی تگ و دو ہی کافی نہیں ہوتی ہے۔ ؏

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

بے لوث سماجی خدمت، علمی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیاں اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر سدابہار ہوتی ہیں۔ کیونکہ ؏

ہنوز تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

(جون ۱۹۶۵ء)

بھارت کی سیکولر حکومت

برعکس نہند نام زنگی کافور

غالب مسلم اکثریت کے مقبوضہ کشمیر پر اپنا تسلّط جمائے رکھنے کا سب سے بڑا جواز بھارتی حکمرانوں کی جانب سے اس وقت یہ پیش کیا جارہا ہے کہ ان کے ملک میں لادینی حکومت ہے اور جملہ مذاہب واقوام کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے لہٰذا کسی جگہ بھی مذہبی اکثریت یا اقلیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سب لوگ مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ مذہب وعقائد کی بنیاد پر کسی سے کوئی بدسلوکی نہیں ہوتی ہے اور بھارت کے سات کروڑ مسلمان سکھ۔ عیسائی اور پارسی وغیرہ جملہ حقوق حکمرانی کے حصول میں اسی پوزیشن میں ہیں جس میں کہ ۴۵ کروڑ ہندو ہیں۔ مذہب کی بنیاد پر کسی بھی خطہ کو آزادی یا حق خود اختیاری دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسا کیا جائیگا تو یہ قرون وسطیٰ کی سی جہالت ہوگی جس میں کہ بھارتی رہنماؤں کے بقول پاکستان مبتلا ہے۔

اسی دلیل کی منادی کرنے کے لئے مسٹر چھاگلہ۔ سید میر قاسم اور سورن سنگھ چند ٹکوں اور جھوٹی عزت کے عوض یو۔ این۔ او میں بھیجے گئے اور اسی نظریہ کا جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کے لئے بھارت کے صدر وزراء اور مختلف پارٹیوں کے لیڈر بیرونی ممالک کا دورہ کرکے وہاں کی حکومتوں کی رائے اپنے حق میں ہموار کرنے

کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھارت کا یہ روپ اور مصنوعی لبادہ دنیا کو دھوکا دینے میں کس حد تک کامیاب ہوگا اس کو مستقبل بتائے گا۔ لیکن جہاں تک تاریخی حقائق کا تعلق ہے ہم کہنے پر مجبور ہیں کہ:۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

اگر بھارت مذہب کو اساس بنا کر کوئی اقدام نہیں کرتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیدر آباد۔ جونا گڑھ۔ منگرول اور مانا وادر جہاں ہندو کی غالب اکثریت تھی وہاں کے مسلمان حکمرانوں کو اس نے کیوں ختم کیا؟ حیدر آباد نے قانونی و دستوری حق کی بنا پر آزاد رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور آخر الذکر ریاستوں نے مسئلہ الحاق میں آزادی کے حق کی بنا پر پاکستان سے الحاق کرنے کا اعلان کر دیا گیا تھا ان مقامات پر قبضہ جمانے کے لئے بھارت کا سب سے بڑا دعوی یہی تھا کہ وہاں کی ہندو اکثریت مسلمانوں کی غلام بن کر نہیں رہ سکتی لیکن جب کشمیر کا سوال آیا تو مسلمانوں کی غالب اکثریت کے باوجود صرف وہاں کے حکمران کے فیصلہ کو اپنا لیا گیا اور اس پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ اصول اُسی وقت اصول کہلانے کا مستحق ہوتا ہے جب تک اس کے اطلاق میں یکسانیت ہو یہ نہیں کہ اپنے مطلب اور نفع کے لیے جب چاہا مسلمہ اصولوں کو گرگٹ کے سے رنگ دے دیئے جائیں۔ چنانچہ پاکستان کا یہی مطالبہ ہے کہ جس اصول کا ڈھونگ رچا کر ہندو اکثریت نے حیدر آباد۔ جونا گڑھ۔ مانگرول۔ اور مانا وادر پر قبضہ کیا اسی اصول کی بنا پر پاکستان کا قبضہ

کشمیر پر ہونا چاہیئے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جس وقت اس برصغیر کی تقسیم ہوئی اس وقت ہندو مسلم منافرت عروج پر تھی۔ اب حالات بدل گئے ہیں اور گذشتہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں بھارت کی ہندو آبادی اور اس کے حکمرانوں کی ذہنیت میں انقلاب آچکا ہے، وہ قطعی غیر متعصب ہو چکے ہیں اور انھوں نے اپنے ملک میں مسلمانوں نیز دوسری اقلیتوں کے لئے ایک طرح کی جنّت ارضی بنا دی ہے کاش ایسا ہی ہوتا تو جب بھی صبر آجاتا۔ لیکن حقائق تو یہ ہیں کہ اس کل مدت میں کشمیر اور بھارت کے غریب اور بیکس مسلمانوں کو طرح طرح کے اظہار وفاداری کے باوجود ایک دن چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ ہر قسم کے سماجی۔ سیاسی۔ اخلاقی۔ مذہبی اور اقتصادی حقوق سلب کر لینے کے بعد مختلف مقامات پر قریب ایک ہزار ہولناک قتلِ عام کیے گئے اور لاکھوں کو ترک وطن پر مجبور کر دیا گیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہ بھی ریکارڈ ہے کہ قاتلوں اور ڈاکوؤں کو ان کی ظالمانہ حرکات کی کبھی کوئی سزا نہیں دی گئی۔ بھارت میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہے۔ اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر کے ان کے لئے دن کا کام اور اور رات کا آرام حرام کر دیا گیا ہے۔

ہندو غنڈوں نے ایسی بربریت کے مظاہرے کیے۔ ایسا انتشار پھیلایا اور اس قدر بے مثال خفیف حرکات کی گئیں کہ زمانہ قدیم کے منگولوں کی دہشت انگیزی بھی اس کے سامنے ماند ہو گئی۔ حد یہ ہے کہ ان ہندوؤں نے اپنے سب سے بڑے محسن اور نجات دہندہ گاندھی جی کو بھی صرف اس خطا پر ہلاک کر دیا کہ

وہ کبھی کبھی مسلمانوں کی حمایت میں بول دیا کرتے تھے۔ جس قوم کی بزدلانہ سنگدلی، تنگ نظری، اور انسانیت سوز حرکات اس انتہا کو پہنچ چکی ہوں وہ آج کس منہ سے بگلا بھگت بن کر سامنے آ رہی ہے اور "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا مکارانہ نعرہ لگا رہی ہے۔

دور نہ جائیے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی وہ تاریخ کہ جب ہندوستان و پاکستان کی جنگ چھڑی۔ اس دن تک بھی پونا اور اس کے نواح میں مسلمانوں کے خلاف قتل و غارتگری کی مہم زور شور سے چلتی رہی اور بکثرت مساجد کو مع نمازیوں کے مسمار کر کے نذر آتش کر دیا گیا۔ وہ تو جب پاکستان کی طرف سے جوابی حملہ میں بے طرح مار پڑی اور ہر محاذ پر شرمناک شکست کا سامنا ہوا تو بطور ڈپلومیسی یہ نسخہ تجویز کیا گیا کہ بھارت کے بیکس مسلمانوں کی مارکاٹ وقتی طور پر ملتوی کر دی جائے اور دنیا کو ہندو مسلم میل ملاپ کا مضحکہ خیز ڈرامہ دکھا کر چھاگلہ۔ سید میر قاسم۔ غلام صادق۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا عتیق الرحمٰن جیسے مفاد پرستوں کی اداکاری کی نمائش کی جائے۔

بہرحال دنیا بھارت کی مکاری اور دوغلے پن کا کس حد تک شکار بنتی ہے اور کس حد تک نہیں۔ ہمیں اس سے مطلب نہیں۔ خود ہمارا موقف یہ ہے کہ ہمارے مشرق بالخصوص پاکستان میں راون راج کا خواب دیکھنے والوں پر ہم کبھی اعتبار نہیں کر سکتے۔ اور ہم نہ صرف اپنے کشمیری بھائیوں کو ان کے چنگل سے چھڑائیں گے بلکہ بھارت کے سات کروڑ مسلمانوں کی بے کسی اور مظلومیت کا بھی خاطر خواہ علاج کریں گے۔

حضرت قائد اعظم مرحوم کا ارشاد تھا کہ بھارت کے مسلمانوں کی خوشحالی کا دار و مدار پاکستان کی مضبوطی پر ہے۔ جس کا ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ثبوت مل گیا کہ جوں ہی پاکستان نے مضبوط قدم اُٹھایا تو بھارتی مسلمانوں کو خود بخود امان مل گئی۔ اس امن و امان کو دائمی بنانا ہے۔

(نومبر ۱۹۶۵ء)

بھارت کی ہندو حکومت

جس طرح ہمارا ملک "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" کہلاتا ہے، اسی طرح اگر بھارت میں لادینی حکومت کے بجائے مہاسبھائیوں اور جن سنگھیوں کی خالص ہندو وانہ مذہبی حکومت ہوتی تو نہ مسلم اکثریت کے علاقہ کشمیر پر بھارت کو قبضہ کرنے کا کوئی جواز ہوتا اور نہ سات کروڑ مسلم اقلیت کو کسی قسم کی تکلیف ہوتی۔ آج کشمیر پر جارحانہ تسلط قائم رکھنے کی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جارہی ہے کہ بھارتی حکومت لادینی ہے اور اس کو جس طرح مسلم اقلیتوں پر حکومت کرنے کا حق ہے اسی طرح کشمیر جیسے اکثریتی علاقوں پر۔ بھارت کے طول و ارض میں موجود سات کروڑ مسلمانوں کو بھی اسی دلیل کی رو سے کوئی جداگانہ اور انفرادی قومی حیثیت نہیں دی جاتی ہے۔ لیکن اگر لادینیت کا یہ منافقانہ ڈھونگ نہ ہوتا تو اقلیتوں کے تحفظ کے متعلق جو بین الاقوامی قانون ہے وہ لاگو ہوتا۔ اور مسلمانوں پر جب بھی کوئی جبر و تشدد ہوتا وہ اپنے معاملہ کو بین الاقوامی عدالت العالیہ میں دادرسی کے لئے لیجانے کے مجاز ہوتے۔ بصورت موجودہ ان پر دادرسی کے سب دروازے بند ہیں۔ اور کسی دوسرے ملک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بھارت کی مظلوم و ستم رسیدہ مسلم اقلیت کے حق میں آواز اٹھا سکے۔ لادینی حکومت کو آڑ بنا کر ہی کشمیر کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ وہ بھارت کا اٹوٹ حصہ ہے۔

سلامتی کونسل کے گذشتہ اجلاس میں بھارت کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ

اور ان کے ساتھیوں نے اسی موقف کی بنا پر اس کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ اور اس کی کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔

اس میں شک نہیں کہ جہاں تک بھارت کے دستور کا تعلق ہے اس کی رو سے تمام باشندوں کو یکساں شہری حقوق حاصل ہیں اور اقلیتوں کے مذہب اور ان کے مخصوص مراسم کے تحفظ کا پورا پورا اطمینان دلایا گیا ہے۔ مگر قانونی دفعات اور تحفظات کے وعدے اس وقت تک سب بے معنی ہیں جب تک کہ ان پر عمل نہ ہو۔ بھارت کے آئین میں۔ مساوات۔ آزادئ مذہب اور اقلیتوں کے ساتھ انصاف غرض سب ہی کچھ لکھا ہوا ہے مگر واقعات کی دنیا میں ان پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ اس کا جواب مختلف اقلیتوں کے حالِ زار اور کشمیری مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے بہ آسانی مل سکتا ہے۔

بھارت کے عام مسلمان اور کشمیر کے مسلمانوں نے سالوں سال اچھی طرح تجربہ کر لیا اور دنیا نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ بھارت کا آئینِ انصاف و مساوات مسلمانوں کے لئے بنایا ہی نہیں گیا ہے اور سب سے بڑی اقلیت ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کو اپنے وطن میں عزت اور خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا کبھی حق نہیں دیا گیا۔ اس وقت بھارتی مسلمانوں کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو خندق میں گر پڑا ہو اس کے باہر نکلنے کی راہیں مسدود ہوں، خندق کی تاریکی دم بہ دم بڑھ رہی ہو۔ بھوک اور پیاس کی وجہ سے نڈھال ہو رہا ہو اور پھر ساتھ کے ساتھ ہر وقت یہ خطرہ بھی لگا ہوا ہو کہ

کوئی بچھو ڈنگ نہ مار دے یا کوئی زہریلا سانپ اُسے نہ ڈس لے۔ ایسی حالت میں بتایئے کہ شخص مذکور کس قدر بے چین اور پریشان ہوگا اور کیسی بے کسی اور کس مپرسی کے عالم میں ہوگا؟ ان حالات کے پیشِ نظر یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جماعتی حیثیت سے مسلمانوں پر اس سے زیادہ نازک دور کبھی نہیں گزرا اور ان کی یہ گراوٹ یونہی بڑھتی رہی تو ہو سکتا ہے کہ اسپین کی تاریخ بھارت میں بھی دہرائی جائے۔

بھارت کے مسلمان جو ایک ہزار سال تک باعزت حکمرانوں کی حیثیت سے رہ چکے ہیں اور اپنی سلطنت جانے کے بعد عہدِ انگلشیہ میں بھی دوسری اقوام کے مقابلہ میں خاصے سربلند رہے۔ آج ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد تیزی کے ساتھ پیوندِ خاک ہو رہے ہیں۔ یہ ہم نے مانا کہ انقلاب نام ہے بدلنے الٹنے پلٹنے کا۔ انقلاب نام ہے عروج و زوال کا۔ انقلاب نام ہے بگڑنے اور بننے کا۔ انقلاب نام ہے پست کو بلند اور بلند کو پست کرنے کا۔ انقلاب نام ہے موت و زیست کا۔ انقلاب ایک ایسا طوفان ہے جو پہاڑوں کو ریگ کے ذروں کی طرح اُڑا دیتا ہے جو آگ لگا کر دریاؤں کو جہنم زار بنا دیتا ہے جو پُر رونق شہروں کو سنسان کھنڈروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جو انسانی آبادیوں اور ملکوں کا نقشہ بدل کر رکھ دیتا ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ اولوالعزم افراد اور قومیں انقلاب کے دھارے کو بدل ڈالتی ہیں۔

یہ صلاحیت اسلام کے نام لیواؤں میں فطرتاً بدرجہ اتم موجود ہے۔ کشمیر اور بھارت میں ہمارے ہم مذہب اور ہمارے خون و جگر فنا کے

گھاٹ اتارے جائیں ان کو ہم پاکستانی کن آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اور کس دل سے گوارا کر سکتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہم پر یہ سوچنا بھی فرض ہے کہ بھارت میں جو انقلابی طوفان برپا ہے اس کا ہمارے دین اسلام پر کیا اثر پڑیگا۔ اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے ہمارے پڑوسی ملک میں باقی رہے گا۔ یا عہد قدیم کے دوسرے آئین و رسوم کی طرح اس کو بھی انقلاب کا سیلاب بہالے جائیگا۔ بھارت میں مسلمانوں کی موجودہ اور آیندہ نسلیں مذہبی حیثیت سے مسلمان رہیں گی یا محض ایک رسمی قومیت کے لحاظ سے مسلمان کہلائینگی۔ یعنی یہ کہ ان کے نام تو محمد علی جھاگو، سید میر قاسم اور غلام صادق وغیرہ جیسے ہوں گے مگر ان کے سینوں میں نہ خدا اور اس کے رسول برحق پر ایمان باقی رہے نہ انھیں قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا یقین ہو اور نہ ان کی صورت وسیرت۔ وضع قطع میں کوئی امتیازی خصوصیت ایسی ہو جس کے ذریعہ انھیں مسلمان سمجھا جا سکے۔

دسمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اس لحاظ سے ایک نہایت ہی مبارک واقعہ ہے کہ اس کی بدولت ہم پاکستان کے مسلمانوں کا مسلسل تلخ تجربات سے گزرنے کے بعد احساس ملی بیدار ہوا ہے اور جنگ کے پہلے راؤنڈ میں ہم نے دنیا اور بھارت پر یہ ثابت کر دیا کہ ہم اپنے ملک کا کامیاب دفاع کر کے بحیثیت ایک آزاد قوم زندہ رہنے کا حق رکھتے ہیں اور جنگ کے دوسرے راؤنڈ میں جس کا جلد یا بدیر پیش آنا ناگزیر ہے ہمیں اپنی خود اعتمادی اور قوت بازو سے یہ کارنامہ بھی انجام دینا ہے کہ

پچاس لاکھ کشمیری اور سات کروڑ دوسرے ہمارے بھائی بند بھارتی مسلمان آزادی کی نعمت سے اسی طرح ہم کنار ہوں گے جس طرح کہ ہم خود ہیں۔ وما توفیقی اِلّا باللّٰہ

کراچی ایام جنگ میں

بحمد للہ بغایت ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء پاک بھارت جنگ کے ایام میں اللہ کے فضل سے یوں تو بفضلہ پورا مشرقی و مغربی پاکستان عظیم حادثات اور نقصانات سے محفوظ رہا اور ہماری بری و بحری و فضائی افواج نے بےمثال بہادری کے کارنامے انجام دے کر تاریخ میں ایک زریں باب کا اضافہ کیا لیکن ۳۵ لاکھ آبادی کے پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کی جس طرح حفاظت کی گئی، اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ رات کے وقت سترہ روز تک بلیک آؤٹ کے ماسوا شہری اور کاروباری زندگی میں مطلق کوئی فرق نہ آیا۔ ہر طرح کا امن و امان رہا جس کے لئے ہر فرد بشر خدائے بزرگ برتر کا سپاس گزار اور اپنی حکومت کا منت گزار ہے۔

کراچی کی انتظامیہ نے بھی اپنے فرائض نہایت تندہی سکون اور اخلاص و ایثار کے ساتھ انجام دئے۔ حکومت کا کوئی محکمہ ایسا نہیں تھا جس نے اس نازک موقع پر غفلت شعاری سے کام لیا ہو۔ کراچی کے شہریوں کا جوش و خروش اور ولولۂ جہاد بھی دیدنی تھا۔ اپنے ملک کے دفاع کے لئے بچہ بچہ اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ کراچی کے اخبارات اور ریڈیو نے بھی ہر شخص کو اچھوتے اور موثر انداز میں ہمہ وقت پیش آنے والے واقعات سے باخبر رکھا جس سے کسی قسم کی ذہنی الجھن میں کوئی مبتلا نہ ہوا۔

دفاعی فنڈ میں چندہ دینے اور جنگ زدہ علاقوں کے لئے فراہمی سامان میں بھی ہر طبقہ کے لوگوں نے اپنی اپنی استطاعت سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

یہ سب ایسی باتیں ہیں جن سے دُنیا کو اندازہ ہو گیا کہ ہماری قوم بیدار ہے اور وقت پڑنے پر بڑی سے بڑی قربانی دے کر اپنے ملی افتخار کا جھنڈا بلند رکھ سکتی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ملت، پاکستان کے زورِ بازو میں بیش از بیش اضافہ ہو۔ آمین۔

دسمبر ۱۹۶۵ء

ہندو مسلمانوں کا قومی مزاج

ایک تقابلی مطالعہ

جس طرح افراد کے مزاج و عادات اور جبلی تقاضے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اقوام کے عادات و خصائص میں بھی باہم اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے اسباب علمائے حیاتیات و نسلیات کے نزدیک کچھ ہی ہوں۔ اور آب و ہوا یا وسائلِ حیات وغیرہ کے موثرات کا کیسا ہی دخل ثابت کیا جائے مگر قوموں کی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ موثر و کار فرما نظر آتی ہے وہ ان کے فکر و نظر کا وہ انفرادی انداز ہے جس سے فرد و جماعت کی زندگی کی جملہ خصوصیتیں تشکیل پاتی اور جبلتوں اور عادتوں کا رنگ اختیار کر کے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو قدیم ہندو اپنی بعض خصوصیتوں میں دُنیا کی تمام دوسری قوموں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ اوہام و اباطیل پرستی کی قدرِ مشترک کو چھوڑ کر اس زمانہ کی "متمدن" قوموں سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ ذات پات کی تقسیم نے اجتماعی زندگی کو محدود ترین دائروں میں اس طرح تقسیم کر رکھا تھا کہ کسی کو ایک دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ ایک دائرہ دھرم رکھشکوں کا دوسرا فوجی سرداروں کا تیسرا دیشوں

کا جو کھیتی باڑی اور تجارت کے ذریعہ لوگوں کی ضروریات زندگی فراہم کرتے تھے اور یہ تھا شودروں اور چنڈالوں کا تھا جنھیں حیوانوں سے بھی فروتر درجہ دیا گیا تھا۔ اور جن کا جان و مال ہر وقت اور ہر حال میں اعلیٰ ذات والوں کے لیے مُباح تھا۔ سیر وسیاحت اور دوسری قوموں سے ربط وتعلق کو بُرا خیال کیا جاتا تھا۔ اور یہ عقیدہ عام تھا کہ سمندر کا سفر کرنے سے دھرم بھرشٹ ہوجاتا ہے۔ تعلیم صرف برہمنوں کے لئے مخصوص تھی اور اگر نیچ ذات کا کوئی آدمی اتفاق سے وید کا اشلوک سُن لے تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔

یہ تھا قدیم ہندوستان کے باشندوں کا طریق فکر ونظام حیات۔ اس کا کوئی جزو ایسا نہ تھا جس پر علیحدگی پسندی و بے تعلقی اور تعصب وتنگ نظری کی مُہرثبت نہ ہو۔ علم کی محدودیت، مجد وشرف کی اجارہ داری اور دوسری قوموں سے بےتعلقی و بے نیازی ہی کا کرشمہ ہے کہ عہد قدیم کا ہندوستان علمی سرمایہ سے یکسر تہی دامن رہا اور ہزاروں سال کی با امن زندگی کے باوجود کوئی ایک کتاب یا کوئی دوسرا ریکارڈ ایسا پیش نہیں کرسکتا جس سے اس زمانہ کی اجتماعی زندگی کی ترقی کا کوئی ثبوت بہم پہونچ سکے۔ اگر کچھ ہے تو دیومالا کے بےسروپا قصے کہانیاں لے دے کر ایک رامائن ہے جو خود اسی قسم کی غیر عقلی داستان سرائیوں سے بھری ہوئی ہے یہ صورت حال عہد قدیم کے اوائل واواسط سے ہی مخصوص نہیں اواخر میں بھی پوری طرح نمایاں ملتی ہے۔ قبل از تاریخ اور مابعد تاریخ تک کے ماخذوں پر نظر ڈال جایئے علم کی اشاعت اور تعلیم کے کسی نظام کا کوئی ثبوت

نہیں ملے گا۔ کالنگا۔ پاٹلی پترا اور ہڑپہ یا ٹیکسلا ہندوازم کے نہیں بدھ مت کے فروغ کے آثار میں شامل ہیں۔ چنانچہ جب بدھ دھرم کو زوال اور برہمنیت کو دوبارہ فروغ ہوا تو تعلیم و تعلم کے یہ مرکز بھی عصبیتِ جاہلیہ کے نذر ہو گئے۔

ایک طرف ہندو قوم کا یہ رنگ تھا دوسری طرف بادیہ نشینانِ عرب ایشیا و یورپ کے درمیان ربط و اتصال کا وسیلہ بنے ہوئے تھے۔ یوں تجارت تو زمانۂ قبل از اسلام سے جاری تھی مگر جب اسلام سے مشرف عرب اہل عالم کی ہدایت و رہبری پر مامور ہوئے تو سرتاسر زندگی کی برکتوں اور سعادتوں کا سرچشمہ بن گئے، ان کے قدم جہاں پہونچے جاہلیت کی نحوستیں دور ہوئیں اور قوموں نے ظلم و جور سے نجات پائی۔

ہندوستان کے مسلم عہد کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کے دم قدم سے یہاں تمدن و معاشرت، فکر و فہم علوم و فنون میں ایسا انقلاب آیا کہ ایک طرف جو لوگ جامہ دوزی کے فن اور ضرورت تک سے ناواقف تھے وہ آداب معاشرت میں مسلمانوں کے ہمدوش بنے تو دوسری طرف علم و فن کے علمبردار مسلمانوں نے بے تعصبی و مساوات اور علوم و فنون کے میدان میں سعی و جہد کا وہ نمونہ اور حسن سلوک و رفق و خلوص کا وہ معیار قائم کیا کہ راعی و رعایا میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ ہندوؤں کو انھوں نے ہر میدان میں آگے بڑھایا۔ تحصیل علم اور ترقی فنون کا ذوق پیدا کیا اور سرپرستی و سربراہی کی ایسی راہیں نکالیں کہ عروج و کمال کی کوئی منزل ایسی نہ رہی جو بلند حوصلہ کی زد سے باہر ہو۔

ایک طرف مسلمانوں کے عہد اقتدار کی یہ خصوصیتیں اور ہندوؤں پر ان کے

یہ احسانات ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کی یہ احسان فراموشی و محسن دشمنی کہ آزاد و صاحب اقتدار ہونے سے پہلے ہی مسلم کشی پر کمر بستہ ہو گئے۔ اور ایک ہزار سال کے حسنِ سلوک کو یک قلم فراموش کر کے ان کے مذہب و تمدن ہی کو نہیں مشترکہ تہذیب کے آثار و مظاہر تک کو مٹانے پر تُل گئے۔

قومی مزاج و قماش کی اس کیفیت کو وقت کی چلتی ہوئی اصطلاحات کے آئینہ میں دیکھنے کی کیسی ہی کوشش کی جائے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ان کی قومی خصوصیت ہے اور محسن کشی و احسان فراموشی ان کا مایۂ خمیر۔ آج کے حالات میں قومی مزاج و خصائص کا یہ تقابلی مطالعہ جہاں تاریخی لحاظ سے مفید و دلچسپ ہے وہاں سیاسی و واقعاتی اعتبار سے بھی عبرت انگیز و سبق آموز ہے۔

(دسمبر ۱۹۶۵ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی صدارت

بھارتی سیکولرزم کی روشنی میں

برصغیر پاک وہند میں انگریز حکمرانوں اور اکثریتی فرقہ کے ہاتھوں قریب ایک صدی کی مسلم دشمنی کی خونی تاریخ کے پیش نظر ۹ مئی ۱۹۶۷ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا بھارت میں صدر جمہوریہ منتخب ہوئے قیام پاکستان کے بعد عہد حاضر کا یہ دوسرا عظیم تاریخی واقعہ تھا۔ یہ وہی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تھے جن کو ۱۹۴۶-۴۷ء کے ہولناک زمانہ میں جالندھر میں غیر مسلم فرقہ پرستوں نے جان سے مار ڈالنے کے لئے گھیر لیا تھا۔ اور بمشکل ان کو ظالموں کے پنجے سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر ہندو قوم کے نجات دہندہ اور محسن اعظم گاندھی جی کو صرف اس قصور میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا کہ وہ خود بھارت کے مفاد میں مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف تھے۔

اسی بھارت میں مسلمان ہونے کے باوجود ڈاکٹر ذاکر حسین کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں سربراہ ملک بنا کر براجمان کیا گیا۔ یہ انقلاب کس قسم کے سیاسی عوامل کا نتیجہ تھا اس پر ہم کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ سب سے پہلے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی قیام گاہ راشٹر بھون کا آنکھوں دیکھا حال ملاحظہ فرمائیے:۔

"قصرِ معلّیٰ کا لفظ شاید مبالغہ سے خالی ہے۔ اللہ اللہ کیا شان و آن کیا جاہ و جلال ہے۔ زینت و جمال کا کمال اگر شاہی محل میں بھی نہ ہوگا تو اور کہاں ہوگا؟ راشٹرپتی بھون یا قصرِ شاہی اپنی وسعت و رفعت میں۔ شان و شوکت میں شاہانِ سابق کے کسی قصر و ایوان سے کم نہیں۔ اور آخر کم ہوتا بھی کیوں؟ انگریزی حکومت کے انتہائی عروج کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔ شہنشاہ ہند و برطانیہ کے نائب السلطنت کے لئے بنا تھا۔ وائسرائے بہادر تو اس میں مستقل رہتے ہی تھے۔ خیال اس کا بھی رکھ لیا گیا تھا کہ برطانیہ کے ولی عہد اور کبھی خود تاجدار برطانیہ بھی اس میں قیام فرمائیں گے۔ اور دوسرے ملوک و سلاطین بھی بطور چند روزہ مہمان کے ٹھہرا کریں گے۔ صناعی اور تکلفات کے لحاظ سے یہ عمارت عہد شاہ جہانی کی شاہی عمارتوں کے ٹکر کی ہے۔ لارڈ ہارڈنگ بیچارے اسی خیال میں تھے کہ وہ اور ان کے بھائی بند ہمیشہ قیمتی پتھروں کے ان قلعوں میں رہیں گے اور کوئی انھیں یہاں سے بیدخل نہیں کر سکے گا۔

وہ کمروں کی تعداد سننے میں آیا ہے کہ ڈھائی سو ہے۔ برآمدے، ہال۔ گیلریاں، صحن، چمن، نشاط خانے کھیل گھر تالاب، حوض غسل خانے۔ باورچی خانے۔ خدا معلوم کتنے۔

وسیع و بلند بر آمدے خصوصاً جاڑے۔ گرمی۔ برسات ہر موسم کے لائق۔ کُل عمارت مع اپنے ملحقات کے کئی فرلانگ (عجب نہیں کہ کئی میل) کے دور میں، قدم قدم پر چوکی پہرے، باہری پھاٹک سے لے کر اندر تک۔ دربانوں۔ محل داروں کی پلٹنیں۔ بلم بردار مسلح سپاہیوں، محافظوں کی فوج کی فوج اور ان ہی کے درمیان اور انہی کے جھرمٹ میں وہ رہ رہا ہے جو جمہوریہ ہند کا صدر ہے۔"

آگے چل کر مولانا ئے محترم راشٹر پتی کے دربار ہال میں تشریف آوری کی ایک جھلک ان الفاظ میں دکھاتے ہیں:۔

"ٹھیک وقت پر صدر محترم بر آمد ہوئے اور ان ہی تکلفات کے ساتھ جو اگلے شاہوں اور شہنشاہوں کے نام کے ساتھ مربوط ہیں، سونے کی کرسی پر براجمان ہوئے۔ نگاہ روبرو کی صدائیں راشٹر بھاشا میں نقیبوں نے لگائیں اور استقبال اسی بھاشا کے قومی ترانے کے ساتھ کیا گیا۔ پھر ایک ایک کے نام کی پکار اور پیشی ادب و قاعدہ کے ساتھ ہوتی رہی کہ پیش گاہِ مبارک سے اتنے اِنچ کے فاصلہ پر فلاں رُخ سے کھڑا ہوا جائے اور جب صدر محترم کھڑے ہو کر تمغہ یا سند عطا کر چکیں تو فلاں

زاویہ سے ہٹا جائے کہ کہیں پشت چہرۂ مبارک کی طرف نہ ہو جائے۔ وقس علیٰ ہذا ـــــ بیسویں صدی کے ثلث آخر میں مغلیہ دربار کے آداب اور کورنش کا نقشہ نظر کے سامنے پھر گیا"۔ (صدق جدید ۵ رمئی سنہ ۱۹۶۷ء)

محترم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا بھارت میں سب سے اونچے عہدے پر فائز ہو جانا اور مذکورۂ بالا راشٹرپتی بھون میں قیام کی معراج حاصل کر لینا بھارت کے سات کروڑ مسلمانوں کے لئے بھی امید اور حوصلہ کا کوئی پیغام لاسکتا تھا یا نہیں؟ سو اس کے لئے ہم ذیل میں مسٹر تیج بہادر سنہا۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈیٹر روہیل کھنڈ اخبار بریلی کا ایک فکر انگیز مضمون پیش کرتے ہیں جو موصوف نے انتخاب صدر جمہوریہ ہند کے سلسلہ میں ۱۱ راپریل سنہ ۱۹۶۷ء کو اپنے اخبار میں سپرد قلم کیا تھا یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے بھارتی سیکولرزم (برعکس نہند نام زنگی کافور) کے تمام پہلو سمجھ میں آجائیں گے :۔

"صدر جمہوریہ اور نائب انتخابات کے سلسلے میں کانگریس اور غیر کانگریسی پارٹیوں کے درمیان مسلم اقلیت کے کسی سربرآوردہ فرد کے سر پر تاج رکھ دینے کے سوال پر مقابلہ کی ریس شروع ہو گئی ہے۔ دونوں پارٹیوں نے

مسلّمہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ کسی مسلمان کو یہ اعزاز دے دینے سے ہی ملک کا سیکولر کردار محفوظ رہ سکتا ہے۔

صدر جمہوریہ کو چوتھے عام چناؤ کے بعد کے حالات میں کیسا کلیدی کردار ادا کرنا ہوگا۔ بین الاقوامی صورت حال سے نبٹنے کے لیے کیسی شخصیت درکار ہے اس کا ملک کی سب ہی پارٹیوں میں کس درجہ احترام ہے۔ ان بنیادی سوالوں کی طرف سے یکسر بے پروائی برتی جا رہی ہے۔

" جس سیکولرزم کی بار بار دہائی دی جا رہی ہے اس کو محفوظ رکھنے کی کیا گارنٹی ہے۔ جب تک ملک کے گوشے گوشے میں اقلیتی طبقوں کے جان و مال کی مکمّل حفاظت کا اطمینان نہ ہو ملک کا سیکولرزم خطرہ میں ہے۔ جب تک نظام آباد، سیہور، بستی اور سہارنپور جیسے غیر معروف مقامات پر مسلم اقلیت کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت نہ ہو سکی مسلمان کے سر پر صدارت کا تاج رکھ دینا یا کسی مسلمان کو وزیر بنا دینا بالکل بے معنی ہے اور اصل مسئلہ کو پس پشت ڈال دینے کے مترادف ہے۔ صرف چند چوٹی کے افراد کو عہدے دید ینے سے مسلمان یا کسی بھی اقلیت کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ امریکہ میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقہ کے عیسائی اس درجہ ایک دوسرے سے دور نہیں تھے جتنے اس ملک کے ہندو اور مسلمان دور رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ پھر بھی امریکہ کی جمہوریت میں کسی کیتھولک کو صدر بننے میں پورے دو سو سال لگ گئے۔

انگستان جو سب سے قدیم پارلیمانی جمہوریت ہے اب تک کسی کیتھولک کو وزیر اعظم بنانے کے سوال پر غور نہ کر سکا۔ بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں جہاں تک اندرونی نظم و نسق کا سوال ہے ایک دوسرے سے ریاکاری کا رویہ برتنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ ان ملکوں کے سیکولرزم کردار پر کوئی بھی فرد یا قوم انگلی نہیں اٹھاتی۔ لیکن ہمیں اس کی بار بار ضرورت اسی لئے پڑتی ہے کہ آئے دن کے یک طرفہ فسادات کی شدت اور نوعیت دنیا کے ہر گوشے میں ہماری مستقل بدنامی کا سبب بن گئی ہے۔

"مگر اصل سوال یہ ہے کہ دنیا کے چھوٹے بڑے ممالک میں سمجھداری اور ذہانت کا اتنا فقدان ہے کہ وہ صرف صدر جمہوریہ کے عہدے پر ڈاکٹر ذاکر حسین کو دیکھ کر یہ بھی سمجھ لیں گے کہ ملک میں مسلم عوام کا بول بالا ہے اور ان کے نمائندے بڑی کلیدی پوزیشن رکھتے ہیں۔ یہ تو پرلے سرے کی بیوقوفی کی علامت ہے کہ دوسروں کو معمولی سوجھ بوجھ سے بھی خالی سمجھ لیں۔

"آج کے حالات سے نمٹنے کے لئے جبکہ صرف ریاستوں میں ہی نہیں مرکز میں بھی وزارتی بحران روزمرہ کا سیاسی مسئلہ ہوگا صدر جمہوریہ کو بار بار آئین میں دی ہوئی طاقت کا استعمال کرنا ہوگا۔ صدارت کے عہدے پر فائز ہونا کانٹوں کا تاج پہننے کے مترادف ہے۔ لیکن جن مسلمان لیڈروں کے نام اس سلسلے میں لئے جا رہے ہیں وہ غیر مشروط طور پر یہ عہدہ جو ان کے لئے اکثریت کی غیر مشروط غلامی کا بھی پروانہ ہے قبول کرنے کو تیار ہیں حالیہ

انتخابات نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ملک کی اکثریت یا تو جن سنگھ کو پسند کرتی ہے یا ایسے کانگریسیوں کو جو دل سے فرقہ پرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بائیں بازو کی طاقتیں اس انتخاب میں نہ ابھر سکیں۔ کسی بھی باعزت مسلمان کو عہدہ قبول کرنے سے قبل یہ یقین دہانی حاصل کر لی چاہیئے کہ اس کے عہدے پر قائم رہنے کے زمانہ میں مسلمانوں کے جان و مال محفوظ رہیں گے۔ اور یہ کہ وہ پہلا ہنگامہ برپا ہوتے ہی اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدے گا۔ اگر یہ شرط لگا دی جائے تو سیکولرزم، سیکولرزم چلانے والی پارٹیاں، سیکولرزم کے معنی اور مفہوم پر صحیح معنوں پر غور کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ اور اس حالت میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ فوری طور پر کسی بھی مسلمان کو یہ جلیل القدر عہدہ نہ ملے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر چوٹی کے مسلمان لیڈر اکثریت کے بخشے ہوئے عہدے ٹھکرانے لگیں تو عام مسلمانوں کی حالت میں ضرور سدھار ہوگا۔ ایک طرف تو معزز مسلمان لیڈروں کو بڑے بڑے اعزازات کی پیش کش کر کے ملک کا سیکولر کردار ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، دوسری طرف کلکتہ سے ایک نئی لہر اٹھی ہے جس سے ایک اور اہم اقلیت کو بھی جان، مال، اور مذہبی آزادی کا خطرہ ہو گیا ہے، ضرورت تو ان مسائل کا حل ڈھونڈنے کی ہے۔ اگر ملک کی اکثریت پر جارحانہ قوم پرستی کے جذبات غالب ہو گئے ہیں تو سیکولرزم کا ڈھونگ زیادہ دنوں نہیں چل سکتا۔ اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ ملک میں سیکولرزم پھولے پھلے تو اس کے لئے دوسرے طریقے اپنانے ہوں گے۔

"سب سے پہلے ہمیں راشٹر بھاشا ہندی کے مسئلے پر غور کرنا ہوگا جو ہندو احیاء پرستی کی تحریک کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر ملک کی تاریخ ایک نئے زاویہ سے لکھی جارہی ہے جس نقطۂ نظر سے راجپوتوں کے دور میں پران مرتب کیے گئے تھے۔ اسی نقطۂ نظر کو بڑھا چڑھا کر اور ہندو قوم کے جذبات بھڑکانے کے لئے آج ہندی ناولوں اور لٹریچر میں قدیم ہندوستان کی ایک نئی تصویر پیش کی جارہی ہے جو حقائق سے جتنی دور ہے اتنی ہی پُرکشش بھی ہے۔ اس کلچرل انقلاب میں ملک کی سب ہی اقلیتوں کے لئے پیغام اجل ہے کیونکہ اکثریت کے آباؤ اجداد اس ملک پر جارحانہ فوج کشی کر کے یہاں کی تہذیب کو مٹانے والے قرار دیے گئے ہیں۔

"اس قدیم جارحیت کے الزام سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اقلیتی طبقوں کے افراد اپنی زبان، اپنی تہذیب ختم کر دیں۔ مذہب کے بارے میں کوئی مطالبہ نہیں ہے لیکن جس ملک میں تہذیب، زبان اور مذہب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں وہاں تہذیب اور زبان مٹ جانے پر مذہب کتنے دن ٹھہر سکے گا۔

"اس وقت سوال جمہوریہ کی صدارت کا درپیش ہے۔ انگلستان کے تاج کی طرح صدر جمہوریہ بھی ملک کے کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر یہ کلچر ملک کی رنگا رنگ ثقافت، چودہ پندرہ تسلیم شدہ اور بیسیوں غیر تسلیم شدہ زبانوں اور پانچ چھ بڑے بڑے مذاہب اور ان کے سینکڑوں فرقوں کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ انھیں باعزت اور مساوی مقام دیتا

ہے تب تو صدر جمہوریہ کا عہدہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور بودھ سبھی کے لیئے موزوں ہے لیکن اگر اس ملک میں ترجیح کسی مخصوص زبان، تہذیب یا مذہب کو دی جارہی ہے تو صدر جمہوریہ چاہے کسی مذہب سے ذاتی طور پر وابستہ ہو لیکن لازمی طور پہ نمائندگی اسی ترجیحی کلچر کی کرے گی۔ ہمارے سابق دونوں صدر جمہوریہ ہندو کلچر کی نمائندگی کرتے رہے ہیں ان کے دور میں یہ کلچر ایک انقلاب کی شکل اختیار کرچکا ہے جسے پنڈت نہرو جیسا وسیع المشرب انسان بھی نہیں دبا سکا۔ شریمتی اندرا گاندھی تو اسے دبانے کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ ان حالات میں کیا توقع ہے آپ ڈاکٹر ذاکر حسین سیکولرزم نامی، ہمارے قومی ڈھونگ کی ترجمانی کا حق ادا کرسکتے ہیں؟ جس کا مطالبہ ان جیسے شریف الطبع انسان سے نہیں ہونا چاہیئے۔

"اس چناؤ میں مسلم اقلیت نے منظم ووٹ کی طاقت کا جو مظاہرہ کیا ہے اسے حقیقت میں کسی بھی سیاسی پارٹی نے پسند نہیں کیا ہے۔ اس نے ملک کے ہوشیار سیاستدانوں کو اس کا توڑ سوچ کر نکالنے کے لئے مجبور کردیا ہے۔ اگر کانگریس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام صدارت کے لئے تجویز کرکے یہی چال چلی ہے تو اپوزیشن جس کا سب سے موثر حصہ جن سنگھ ہے نائب صدر کے عہدے کے لیے نواب علی یاور جنگ بہادر کو میدان میں لے آیا ہے، ڈاکٹر صاحب اپنی نائب صدارت کے دور میں اردو کے لیے کچھ نہ کرسکے۔ اور بچاسوں یکطرفہ فسادات کو نہ صرف پی گئے بلکہ بین الاقوامی

سطح پر ہمارے بیداغ سیکولرزم کی داد بھی دے چکے ہیں۔ مسٹر علی یاور جنگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسلم کردار کے خاتمے کی نشانی بن چکے ہیں۔ مسلم ووٹ کی طاقت کا اثر زائل کرنے کے لئے دونوں موزوں ترین شخصیت تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ یہ عہدے کسی ایسے مسلمان کے لئے پیش نہیں کئے جاسکتے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ترجمانی کر سکتا ہو۔ خود کانگریس کے اندر ڈاکٹر سید محمود کی شخصیت موجود ہے جن کی ایک اپیل نے شریمتی اندرا گاندھی کو میدان انتخاب میں کامیاب کرا دیا۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے زیادہ پرانے کانگریسی بھی ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی بھی لیکن کسی پارٹی نے ان کا نام تجویز نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نمائندگی مسلمانوں کی نہیں بلکہ سیکولرزم کے ایک خاص نظریئے کی مقصود ہے۔ جس پر ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں متفق ہیں۔ اجتماع رائے اصول پر تو موجود ہے صرف شخصیات کی صلاحیتوں پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔

"ملک کی سیاست کے اس نئے موڑ پر اور ہوشیار سیاستدانوں کی نئی نئی چالوں پر مسلمانوں کے لئے قدم قدم پر دام فریب ہے۔ آج اجتماع اس بات پر ہے کہ مسٹر علی یاور جنگ مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کر سکتے مگر مسلمان کی نمائندگی کا سوال ہی کہاں ہے اصل سوال تو سیکولرزم کی نمائندگی کا ہے اور جب سیکولرزم کی اسپرٹ اس درجہ غارت ہو چکی ہو کہ بعض اقلیتوں کو ہر وقت جان و مال کا اندیشہ ہو۔ اقلیتی طبقوں کے تمام افراد پر سرکاری ملازمتوں

کے ہی نہیں بلکہ صنعتوں میں داخلے کے بھی دروازے بند ہوں تو اس نام نہاد سیکولرزم کی نمائندگی کا حق کیسے پہونچتا ہے۔ اس وقت تو قربانی کے بکرے کی تلاش ہے۔ آنے والے مہینے بتائیں گے کہ اپوزیشن میں سب سے موثر آواز جن سنگھ کی ہے اور خود کانگریس میں ستر فیصد حضرات جن سنگھی ذہنیت رکھتے ہیں"۔

(جون سنہ ۱۹۶۷ء)

بھارت کے بے بس مسلمان

آل انڈیا جن سنگھ کے پریذیڈنٹ نے نئی دلی میں ایک پریس رپورٹ کے مطابق اعلان کیا کہ "ہندی مسلمانوں کو اپنے ماضی کو بھول جانا چاہیے۔ اور اپنے آپ کو ہندو قومیت میں ضم کر لینا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر مسلمان ہندوستان میں اپنے قیام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں تو ان کو محمد غوری کے بجائے پرتھوی راج کو اپنا ہیرو ماننا چاہیئے۔ اور محمد بن قاسم کے بجائے اشوک اور کنشک سے اپنا نسب ملانا چاہیئے۔"

مسٹر مدھوک نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پر بھی حملہ کرتے ہوئے کہا کہ "اس ادارے نے سانپوں کی پرورش کی ہے۔ جس نے ہندوستان کے اتحاد کو خراب کر دیا۔

"۱۹۴۷ء میں اس ادارہ کا زہریلا درخت خشک ہو گیا تھا لیکن اب وہ پھر ہرا ہو گیا ہے۔" آخر میں مدھوک نے سردار پٹیل کو جن سنگھ کا ہیرو قرار دیا اور ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ہم انھیں کی تعلیمات اور پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں۔"

مندرجۂ بالا بیان کو بھارت میں منجملہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے صرف ایک سیاسی پارٹی کے افکار کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ بیس بائیس سال کا تجربہ شاہد ہے کہ لادینی حکومت کے بلند بانگ دعووں کے باوصف

مرکزی اور صوبائی حکومتیں نہ صرف یہ کہ مہاسبھا اور جن سنگھ کے بڑھتے ہوئے زور کو کم نہ کر سکیں بلکہ ان کی پس پردہ حمایت کرتی رہیں بسات سو سے زیادہ ہولناک بلوے ہوئے۔ ہزاروں بے قصور مسلمان شہید اور زخمی کئے گئے، لاکھوں کو بے خانماں کیا گیا، یہ ریکارڈ بھی ہے کہ کسی ایک قاتل یا مجرم کو سزا نہیں دی گئی۔ نیز بھارت کی فوج اور پولیس مظلوموں کی حفاظتِ جان و مال کا فرض ادا کرنے کے بجائے الٹی حملہ آوروں کی پشت پناہی کرتی رہی۔ یہ صورت حال اس وقت تھی جبکہ بڑے بڑے ذی اثر کانگرسی نیتا پنڈت جواہر لال نہرو۔ راجندر پرشاد اور راجگوپال آچاری برسرِ اقتدار تھے۔ اور مرکز اور صوبوں میں کانگرس کی غالب اکثریت تھی۔ ایسے میں سات کروڑ ہندی مسلمانوں اور پچاس لاکھ کشمیریوں کے جان و مال کی حفاظت اور ان کے مذہبی، ثقافتی، لسانی، معاشی اور سیاسی مفادات کا تحفظ کس طرح ممکن ہے۔

بھارت کے صدر یا وزیرِ اعظم اور ان کے رفقائے کار چونکہ قطعاً بے اثر ہیں اس لئے اصلی حکومت اور طاقت جس کو بھارت کی پوری غیر مسلم جنتا تسلیم کرتی ہے اور اس کی ہدایت پر عمل بھی کرتی ہے۔ وہ مہاسبھا اور جن سنگھ کی طاقت ہے اور مہاسبھا اور جن سنگھ جو کچھ کر رہی ہے اور آئندہ کرنا چاہتی ہے اس کا آئینہ دار مسٹر مدھوک کا وہ بیان ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا۔

ہم اکثر سوچتے ہیں کہ یہ جو پاکستان کے سربراہ باربار بھارت سے بامقصد سمجھوتہ اور مصالحت کی اپیلیں کرتے ہیں تو ان کا اصل مخاطب کون ہوتا ہے؟ اگر بفرضِ محال مسز اندرا گاندھی کی حکومت پاکستان سے کوئی

سمجھوتہ کر بھی لے تو اس کو عملی جامہ پہنانے کی اس کے پاس کیا طاقت ہے؟ بھارت کی فوج، پولیس، ہر سطح کے کارکنانِ حکومت اور عام پبلک تو جن سنگھ کا کہنا مانتی ہے۔ جس کی بابت تجربہ شاہد ہے کہ اس کا نصب العین پاکستان کا وجود ختم کر کے اکھنڈ بھارت بنانا اور برصغیر کے پندرہ سولہ کروڑ مسلمانوں کے وجود کو بالکلیہ ختم کر دینا ہے۔ تا وقتیکہ خود مہاسبھا اور جن سنگھ کی ذہنیت اور مطمحِ نظر میں انقلاب نہ آئے جس کی بظاہر کوئی اُمید نہیں۔ اس وقت تک پاکستان سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو بھی جائے تو بے نتیجہ ہو گا۔

صحیح بات وہی ہے جو حضرت قائداعظمؒ نے فرمائی تھی کہ "بھارتی مسلمانوں کے ہر قسم کے تحفظ کی واحد ضمانت پاکستان کا مضبوط سے مضبوط تر ہونا ہے"۔

آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے ہاتھوں جب بھارت کو لڑائی میں زبردست شکست ہوئی تو قریب ڈیڑھ سال تک بھارتی مسلمان نہ صرف امن سے رہے بلکہ ان کی طرح طرح کی خوشامد اور چاپلوسی بھی کی گئی۔ لیکن جون ۱۹۶۷ء میں عربوں کی اسرائیل کے مقابلہ میں شکست کے بعد جو درحقیقت سب اسلامی ممالک بشمول پاکستان کی بے وقعتی کا باعث ہوئی تو بھارتی فرقہ پرستوں نے از سرِ نو سر اُٹھایا ہے اور رانچی۔ جموں۔ جبلپور اور احمد آباد وغیرہ مقامات پر لرزہ خیز مظالم ڈھانا شروع کر دیئے اور بھارت کی مرکزی و صوبائی حکومتیں حسبِ معمول اُن کا انسداد کرنے سے قاصر رہیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں نہ تو کسی کی مجال ہے کہ وہ یہاں کی اقلیتوں کے خلاف مسٹر مدھوک کی سی زہریلی تقریریں کر سکے اور نہ کسی فرد یا جماعت کے لیے یہ ممکن ہے کہ سخت اشتعال کے باوجود بھی ان کی

جان ومال کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔ ہماری ہمیشہ سے روایت رہی ہے کہ قائدِ اعظم اور قائدِ ملت کی ہدایات سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے۔ بھارت کا سا قصہ نہیں ہے کہ "جن چرمی سر ایم ڈملبورنا" جن جو مرا یہ ہمارے مندرجہ بالا تاثرات پاکستان میں مقیم ایک پاکستانی کے کہہ کہ ممکن ہے قابلِ اعتنا نہ سمجھے جائیں لہٰذا ذیل میں ہم بھارت کے مسلمانوں سے متعلق چار الیسوں کی روداد نقل کرتے ہیں جو خود وہاں کے مستند لوگوں نے سپردِ قلم کی ہے۔

جن سنگھ کا اقتدار

ادارہ معارف اعظم گڑھ

"یوپی، بہار اور بعض دوسری ریاستوں میں جب سے جن سنگھ کا اقتدار قائم ہوا ہے اس نے حکومت کو اپنی پالیسی کے مطابق ڈھالنا اور منظم طریقہ سے مسلم کُشی کا سلسلہ شروع کردیا ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ آگ پورے ملک میں پھیل جائیگی۔ جن سنگھ اور دوسری تسلطائی جماعتوں کا نقطۂ نظر بالکل کھلا ہوا ہے۔ وہ سیکولرزم اور جمہوریت کو نہیں مانتیں۔ ان کا نصب العین ہندو حکومت کا قیام اور برہمنی تہذیب کا احیاء ہے اس کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمان ہیں، وہ ان کے وجود اور ان کی جانب منسوب ہر چیز کی دشمن ہیں۔ اس کا سب سے آسان نسخہ پاکستان ہے جس کے نام سے وہ اکثریت کے جذبات کو بھڑکاتی رہتی ہے۔ درحقیقت اس کی مسلم دشمنی پاکستان کے قیام کا نہیں بلکہ اس تسلطائی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو اپنے علاوہ کسی فرقہ، کسی مذہب

اور کسی تہذیب کو برداشت نہیں کرسکتیں اور یہ ذہنیت بہت قدیم ہے۔ اسی نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کو اچھوت بنایا جو آج تک مظلوم ہیں۔ اسی نے بدھ مت کا خاتمہ کیا اور ہندوستان سے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ پاکستان کا قیام بھی درحقیقت اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ مگر انگریزی حکومت کے زمانہ میں یہ ذہنیت نہیں چل سکتی تھی۔ اسی لئے دبی رہی۔ آزادی ملتے ہی ابھر آئی۔ البتہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے قیام نے اس میں اور شدت پیدا کردی۔ اگر پاکستان نہ بھی بنتا تب بھی یہ ذہنیت موجود رہتی۔ یا ممکن ہے کہ اس کو زیادہ ابھرنے کا موقع نہ ملتا اور مسلمان اتنے بے بس نہ ہوتے اور اگر بفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ مسلم دشمنی پاکستان ہی کے قیام کا نتیجہ ہے تو اس کا انتقام پاکستان والوں سے لینا چاہیئے، ان پر تو بس نہیں چلتا سارا نزلہ ہندوستان کے بے بس مسلمانوں پر گرتا ہے جو نہ بہادری ہے، نہ شرافت۔ سب سے زیادہ لائق مذمت ہماری جمہوری اور سیکولر حکومت ہے جو آج تک شہریوں کے جان و مال کا تحفظ نہ کرسکی۔

درحقیقت فرقہ پروری اور فسطائیت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ اسی لئے فسطائی ذہنیت محض مسلمانوں کی دشمنی تک محدود نہیں۔ کم و بیش تمام اقلیتیں اس کا شکار ہیں حتیٰ کہ سکھ بھی جو ہندو مذہب ہی کی ایک ترقی یافتہ شاخ ہیں اس سے محفوظ نہیں۔ جہاں مذہب کا اختلاف نہیں ہے وہاں دوسری شکلوں میں یہ ذہنیت ظاہر ہوتی ہے۔ اچھوت قومیں اس کے

ذلت آمیز سلوک اور جنوبی ہند والے لسانی اور تہذیبی جارحیت سے نالاں ہیں، مسلمان سب سے زیادہ اس لئے نشانہ ہیں کہ وہ اپنی تعداد کے لحاظ سے ایک پوری قوم اور اپنے مذہب اور تہذیب و روایات کے اعتبار سے ایک مستقل ملت اور اپنا انفرادی وجود رکھتے ہیں اس لئے فسطائی ذہنیت کی زد سب سے زیادہ انہی پر پڑتی ہے۔ اگر مسلمان درمیان میں نہ ہوں تو یہ مادہ آپس میں ہی پھوٹ نکلے اور اب بھی مختلف شکلوں میں پھوٹتا رہتا ہے۔ اسی ذہنیت نے پہلے بھی ہندوستان کو نقصان پہنچایا ہے اور آئندہ بھی اس کو متحد اور مستحکم نہ ہونے دیگا۔

"اس میں سب سے زیادہ قصور کانگریس اور اس کی حکومت کا ہے، جب اس فتنہ کو دبانے کا وقت تھا اس وقت وہ عوام میں مقبولیت اور حکومت کی طمع میں اس کو اس قدر ڈھیل دیتی بلکہ پرورش کرتی رہی کہ فسطائی طاقتوں نے کانگریس اور حکومت میں گھس کر خود ان کو بدل دیا۔ بعض پرانے اور مخلص لیڈر ان کے خلاف برابر آواز بلند کرتے رہے لیکن آخر میں وہ بھی ان کے مقابلہ میں بے بس ہو گئے اس کے بعد خود حکومت نے اُن کے سامنے سپر ڈال دی۔ اور فسطائی جماعتوں کو مشیر بنا لیا اس لئے ان کو طاقت پکڑنے کا موقع مل گیا جس کا نتیجہ خود کانگریسی حکومت کو بھگتنا پڑا۔ اور وہ دن دُور نہیں جب جن سنگھ ریاستوں سے لیکر مرکزی حکومت تک پر قابض ہو جائے گی اور ہندوستان سے سیکولرزم اور جمہوریت کا خاتمہ اور پورا ملک انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو جائے گا اس لئے اب یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ سیکولرزم

اور جمہوریت اور ملک کے تحفظ و بقا کا مسئلہ ہے۔

"مگر اب فسطائی طاقتیں اتنی قوت پکڑ چکی ہیں کہ ان کا مقابلہ آسان نہیں ہے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ تمام ترقی پسند پارٹیاں اور اقلیتیں جو سیکولرزم اور جمہوریت کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں اسی سرفروشی اور ایثار و قربانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں جس طرح کانگریس نے انگریزی حکومت کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ گاؤں گاؤں میں پھر کر اس مہم کو چلائیں اور اس راہ میں عوام میں مقبولیت اور حکومت کے اقتدار ہر چیز کی بازی لگا دیں تو اس وقت کامیابی کی کچھ اُمید ہو سکتی ہے۔ محض زبانی تقریروں، بیانات اور قومی یکجہتی کی انجمنیں بنانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مگر سوال یہی ہے کہ کیا اب بھی ہندوستان میں ایسی بے لوث اور ترقی پسند جماعتیں موجود ہیں جو اس ایثار و قربانی کے لئے تیار ہوں، عوام میں مقبولیت اور حکومت کی چاٹ بڑی مشکل سے چھوٹتی ہے۔ وقت آنے پر سب کی حقیقت کھل جاتی ہے اس لئے ہندوستان میں سیکولرزم اور جمہوریت کا مستقبل بظاہر تاریک نظر آتا ہے۔ فرقہ پرور اور فسطائی جماعتوں کے حوصلے اس لئے اور بڑھ گئے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کی جان و مال سے کھیلنے کی پوری آزادی ہے ان کے لیڈر اور اخبارات مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلاتے رہتے ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں، فساد کو روکنے کا پہلے سے کوئی انتظام نہیں کیا جاتا۔ فساد کے موقع پر امن و امان کے محافظ خود فریق بن جاتے ہیں۔ فساد میں مسلمان ہی تباہ و برباد ہوتے ہیں اور اُلٹے وہی پکڑے جاتے ہیں۔ فسادیوں سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔

چنانچہ آج تک کسی فساد میں مجرموں کو سزا نہیں ملی۔ ایسی حالت میں فساد کا ہونا نہیں، نہ ہونا تعجب انگیز ہے۔ اگر حکومت سنجیدگی سے فساد کو روکنا چاہتی ہے تو اس کو چاہیے کہ فرقہ پروروں کی زبان و قلم پر پابندی عائد کرے۔ فساد کے موقع پر حکام اور پولیس کی غفلت کی سختی سے بازپرس کی جائے، فسادیوں کا پتہ چلا کر ان کو پوری سزا دی جائے۔ فوج اور پولیس میں مسلمانوں کو بھرتی کیا جائے۔ اگر حکام اور پولیس دیانتداری سے اپنا فرض انجام دیں تو بڑی حد تک فساد کا خاتمہ ہو جائے یا کم از کم وہ سنگین صورت اختیار نہ کرنے پائیں، اس کے بغیر محض اظہار افسوس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

۲۔ جامعہ کا المیہ | آئندہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ہفتہ وار تعطیل جمعہ کو نہ ہوا کرے گی۔ آئندہ جامعہ کی کسی تقریب اور جلسہ کا افتتاح تلاوتِ قرآن مجید سے نہ ہوا کرے گا۔ اور یہ حکم نامہ کس نے لکھ کر دیا ہے؟ یقین کر لیجیے کہ باضابطہ سرکلر کی صورت میں یہ اُس جامعہ کے وائس چانسلر نے جاری کیا ہے جس کا نام اب تک جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے اور جس کے بانیوں میں نام آتے ہیں شیخ الہند مولینا محمود الحسن اور مسلمانوں کے محبوب لیڈر محمد علی جوہر کے...!

خبر پر یقین کسی طرح نہیں آرہا ہے لیکن بہرحال "الجمعیۃ" کے ذمہ دار ایڈیٹر نے اس پر تبصرہ کیا ہے اور اس کے علاوہ اس پر کچھ لکھنے کے بعد اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی کچھ کم عبرت انگیز نہیں۔

" اسی جامعہ ملیہ میں چند ہی روز پہلے گاندھی جینتی کی تقریب بہت

دھوم سے منائی گئی۔ مقرروں نے گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت فرمائی اور بار بار حضرت مسیح کا نام لیا مگر کسی کی زبان پر نام نہیں آیا تو اس گرامی شخصیت کا جس کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حضورؐ کا نام لینا آج اسلامی اداروں میں شرمناک بنتا جا رہا ہے۔ خود مسلمانوں کو اسلام اور داعی اسلام کا نام لیتے آج شرم آنے لگی ہے۔

"ذہنی ارتداد کی بنیاد تو اس جامعہ اسلامیہ مرحوم میں اسی دن پڑ گئی تھی جب "اکثریت" کے داخلے اندھا دُھند اور بے تحاشہ ہونے لگے۔ حالانکہ اس کا نتیجہ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا تھا، سارے مطالبے تو فرع ہیں اُس اصل کی، جب اتنی کسی ادارہ میں اکثریت ہو جائے گی تو کھلے ہوئے مطالبے ان کے بھی ہوں گے کہ اب غلبہ و اقتدار اقلیت والوں کا نہیں۔ اکثریت والوں کا ہے اور وقت اس کا آگیا ہے کہ اقلیت والے :- ؏

ایسے بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

بہر حال اب تو ہم آپ یہ دیکھنے کے لئے زندہ ہیں کہ جامعہ کی شدھی کس دن مکمل ہو کر رہتی ہے! حیرت اس پر ہے کہ جامعہ کے اسٹاف میں کم سے کم تین شخصیتیں تو ایسی ضرور تھیں جن کی اسلامیت اور حمیت دینی نا قابلِ انکار تھی۔ اور یقین تھا کہ وہ اپنی ملازمتوں سے دستبردار ہو جانا گوارا کر لیں گے، جامعہ میں قفل ڈال دینا پسند کر لیں گے لیکن اس ملت فروشی کے قریب بھی نہ جائیں گے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بالآخران کا بھی ایمان کمزور پڑ گیا۔ اور انھیں عافیت ہتھیار ڈال دینے ہی میں نظر آئی!"

(صدقِ جدید لکھنؤ)

مزید ایک مسلم روزنامہ سے :۔ "جن سنگھ کے صدر نے جامعہ کے ہندو طلبہ کو شہ دی کہ وہ اپنی شکایات کے لئے ایک میمورنڈم پیش کریں۔ فوراً حکم کی تعمیل کی گئی۔ اور کہا گیا کہ جامعہ میں قومی ترانہ نہیں گایا جاتا۔ اس کی اسّی فیصدی ہندو طلباء کی موجودگی میں اتوار کے بجائے جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے۔ جامعہ میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ ہر جلسہ کا افتتاح تلاوتِ قرآن سے ہوتا ہے۔ اور سو جرموں کا ایک جرم یہ کسی زبان پر نہ آیا کہ مہراج بلراج مدھوک کے الیکشن کے موقعہ پر حلقۂ جامعہ سے مسلمانوں میں سے کسی نے تقریباً کسی نے بھی انھیں ووٹ نہیں دیا تھا! ——— یہ جرمِ عظیم و اعظم بھلا کس طرح قابل معافی ہوسکتا تھا (یاد کر لیجیے وہ تلخ بیان جو مہراج نے اپنے الکشن کے بعد ہی دیا تھا)

"کیا جن سنگھ کا دلیر اور دلاور صدر اب بھی یہ عہد نہ کرتا کہ میں اس جامعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہوں گا ——— اور انھیں وہ مزا چکھاؤں گا جس سے یہ تلملا کر رہ جائیں گے اور اس سے پناہ دینا نہ صدر جمہوریہ ہند کے بس میں ہوگا۔ نہ کسی اور کے" (صدق جدید لکھنؤ)

۳۔ مسلم یونیورسٹی کا المیہ | مسلم یونیورسٹی کا سرکاری گزٹ ۲۴ اگست پیش نظر ہے جس میں امتحانوں کے نتیجے چھپے ہیں۔ خلاصۂ نتائج اعداد کی شکل میں آپ سن لیں۔ اگر برداشت کی قوت رکھتے ہوں پہلے ایم۔ اے (فائنل) کو لیجیے۔

اُردو، فارسی، عربی کو چھوڑ کر، کہ ان تینوں مضمونوں میں کامیاب تو

مسلمان ہی مسلمان ہیں۔ (۲۳ + ۸ + ۷ کی تعداد میں) باقی نتائج مضمون وار ملاحظہ ہوں۔

	غیر مسلم	مسلم		غیر مسلم	مسلم
۱۔ انگریزی	۷۲	۲۴	اب چند دوسرے امتحانات:-		
۲۔ اکنامکس	۶۶	۲۱	ام، کام (فائنل)	۴	۱۰
۳۔ تاریخ	۲۱	۷	ام۔ ایڈ	۵	۷
۴۔ پولیٹیکل سائنس	۲۹	۱۱	ام، ایس پتھالوجی	۳	صفر
۵۔ فلاسفی	۶	۴	ال، ال، ام (فائنل)	۲	۱
۶۔ سائیکالوجی	۳	۵	ال، ال، بی (فائنل)	۱۱	۲۶
۷۔ ہندی	۶۸	۴	ام، بی، بی ایس (فائنل)	۹	۲
۸۔ سنسکرت	۹	صفر	بی، اے (پارٹ ۲)	۲۲	۸۳
۹۔ میتھمیٹکس	۱	۱	بی، ایس، سی (پارٹ ۲)	۴۱	۱۱۸
۱۰۔ جیوگرافی	۴	۱۰	بی کام (پارٹ ۲)	۵	۲۲

اب ام۔ ایس۔ سی (فائنل کو لیجیے)۔

(۱) میتھمیٹکس	۴	۸	بی، ایس، سی انجینئرنگ		
(۲) اسٹیٹکس	۴	۱	(الف) الکٹریکل	۲۵	۱۶
(۳) جیوگرافی	۱	۱	(ب) مکینکل	۳۳	۳۴
(۴) جیالوجی	۶	۱۰	بی ایڈ	۱۵	۶۵
(۵) فزکس	۱۳	۱۱	چند نسبتاً کم اہم امتحان اور بھی ہیں:-		

	غیر مسلم	مسلم		غیر مسلم	مسلم
(۶) کیمسٹری	۱۴	۱۶	پری یونی ورسٹی (آرٹس)	۲۳	۱۶
(۷) بایوکیمسٹری	۱	۷	،، ،، (سائنس)	۱۳	۳۰۰
(۸) باٹنی	۲	۱۱	پری میڈیکل	۲۶	۶۶
(۹) زولوجی	۴	۱۸			

"اس "مسلم" یونیورسٹی کے لیے سرسید نے اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا؟ جسٹس سید محمود اور سید حسین بلگرامی، محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی کی آنکھوں کا تارا یہی مسلم یونیورسٹی تھی؟ محمد علی اور شوکت علی حسرت موہانی اور رفیع احمد قدوائی، مجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے زمانہ کا یہی علی گڑھ ہے۔

"رواداری کے یہ معنی، بجز ہم بدنصیبوں کے اور کس کے لغت میں ملیں گے کہ خاص الخاص اپنی چیز میں غیروں کو شریک ہی نہ کیا جائے، بلکہ انھیں برابر کا حصہ دار بنایا جائے! نہیں، بلکہ ان کا حصہ اپنوں سے کہیں زائد بڑھا دیا جائے۔!

ع آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

"ہم اب اتنے گئے گذرے ہو چکے ہیں کہ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ جس یونیورسٹی کو اپنی کہہ اور سمجھ رہے ہیں اس میں طلبہ کا کوٹا اپنی غالب اکثریت کا رکھ دیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان طلبا

کی تعداد کسی حال میں بھی ۸۵ یا ۹۰ فیصدی سے کم نہ ہونے پائیگی" (صدق جدید لکھنؤ)

۴۔ اُردو کا المیہ

از تیج بہادر سنہا۔ ایم اے ایڈوکیٹ
ایڈیٹر روہیل کھنڈ اخبار بریلی

"رانچی کے خونی ڈرامے نے اُردو کے المیہ کا رنگ گہرا کر دیا ہے ملک رجعت پسندی کے اس موڑ پہ آگیا ہے جبکہ ہزاروں سال پہلے کی طرح نہ کوئی حکومت تھی اور نہ کوئی نظم ونسق، اب حکومت صرف ٹیکس وصول کرنے کی مشینری بن کر رہ گئی ہے۔ ملک کا اندرونی حملہ آوروں سے تحفظ کسی کی بھی ذمہ داری نہیں ہے۔ طوائف الملوکی اور نراج انھیں حالات کا نام ہے جن میں رانچی اور اس کے مضافات کے امن و امان میں آگ لگ گئی ہے اور ملک کے وفادار اور امن پسند شہریوں کے جان و مال پر بن آئی۔

"اردو محض ایک زبان نہیں ہے وہ ایک تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے جس میں انسانیت ایک بلند مقام پر فائز ہے وہ اسلام اور ہندو دھرم کی بہترین قدروں کا مجموعہ ہے جس میں انسان دوسرے انسانوں کے عقائد کا احترام سیکھتا ہے۔

"اس نے ہندوؤں کو مرثیہ لکھنا سکھایا اور مسلمانوں کو بھگوان رام اور بھگوان کرشن کا عقیدتمند بنا دیا اس نے دو سو سال تک غیر ملکی اقتدار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جنگ آزادی کا بگل بجایا۔ لڑنے والے سورماؤں کو انقلابی جذبات سے سرشار کیا۔ ملک کے گوشے گوشے میں ہندوستانی زبان۔ ذریعۂ اظہار بنی۔ جس وقت سارے ملک میں انگریزی کا بول بالا تھا۔

اُس نے قومی زبان کا فریضہ ادا کیا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد غیر ملکی حکمرانوں نے اُس چیز پر حملہ کیا جو ملک کے منتشر عناصر کی شیرازہ بندی کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ بات بھی چھپی نہ رہی کہ اُردو زبان ہندو اور مسلمان کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھا کرتی ہے۔ جہاں انگریز مورخوں نے ملک کی تاریخ کو مسخ کیا اور ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے دور کو ایک تاریک عہد میں بدل دیا۔ وہاں اُردو کے مقابلے میں ہندی زبان رکھ کر ہمارے عوام کو یہ سمجھایا گیا کہ یہ اُن کی اصلی اور قدیمی زبان ہے جس کے احیاء سے ان کی بہترین تہذیبی اقدار وابستہ ہیں قومی زبان کی تقسیم کر کے ملک کی تقسیم کے لئے راستہ ہموار کر لیا گیا۔ دراصل پاکستان تو اسی دن معرضِ وجود میں آگیا تھا جب ہندوؤں نے سیکڑوں سال کے بھائی چارہ اور اخلاص کو خیرباد کہہ کر اُردو کی مخالفت شروع کر دی۔

"جو لوگ مسلمانوں پر ملک کی تقسیم کا الزام رکھتے ہیں وہ یہ کیسے بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہ دیش سیکڑوں ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور ہر ٹکڑے کی بولی رہن سہن اور طرزِ معاشرت جداگانہ تھا۔ ان منتشر ٹکڑوں کی شیرازہ بندی کا شرف سب سے پہلے مسلمان فاتحین کو نصیب ہوا اور بعد کو یہی عمل انگریزی تسلط کے ذریعہ تکمیل کو پہنچا۔ کٹر ہندو معاشرہ زمانۂ قدیم سے سماج کے مختلف طبقوں میں اونچ نیچ کا جذبہ پیدا کرتا رہا ہے جس سے ہر دور اور ہر حصے میں تقسیم کا مطالبہ ہوتا رہا ہے۔ جس شدت سے ملک کے ایک حصہ نے بالادستی اور تسلط کا دعویٰ کیا ہے اسی شدت سے ساتھ دوسرے حصوں اور سماج کے دوسرے طبقوں نے اس دعوے کو

مسترد کیا ہے آج بھی قومی زبان کے نام پر ہندی کی بالادستی ملک کے بہت سے حصوں میں ناقابلِ قبول ہے۔

"ملک کی تقسیم اس طرزِ معاشرت کا لازمی نتیجہ تھی جسے ہم ہند و دھرم کا ایک جزوِ لاینفک سمجھ کر آج تک سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اگر چھوت چھات اور کھانے پینے کے امتیازات کو پہلے مسلمانوں نے محسوس کیا تو نام نہاد اچھوت قومیں اُنھیں آج بڑی شدّت سے محسوس کر رہی ہیں۔ یا تو علیحدگی پسندی کا یہ جذبہ ختم کر دینا ہوگا یا ملک کو بار بار تقسیم کرنا ہوگا۔ جس سے سماج کے ہر طبقے کو اُبھرنے کا موقع مل سکے۔ آج اگر لسانی بنیادوں پر ریاستیں معرض وجود میں آرہی ہیں تو کل ذات پات کے امتیازات ریاستوں میں ریاستیں پیدا کر دیں گے۔ کیا اس عمل کے لئے مسلمانوں کی ذرہ بھر بھی ذمہ داری ہے جو اپنے مذہبی عقیدے اور معاشرے کی بُنیاد پر بین الاقوامی اتحاد کا مدعی ہے جہاں عرب، عجم اور ترک کو ایک دوسرے پر نہ کوئی ترجیح ہے اور نہ کوئی فوقیت۔

"انگریز کی رخصت ہونے نام نہاد آزادی کے بعد ملک میں صرف ایک طبقہ اُبھرا ہے جو سماج دشمن عناصر پر مشتمل ہے یہ حصول زر کے لئے غریب ترین طبقوں کا خون چوس رہا ہے۔ آج کی کمر توڑ مہنگائی اور اشیائے ضروری کی قلت سب اسی طبقے کی پیدا کردہ ہیں۔ یہی طبقہ اپنی دولت کا سہارا لیکر غریب اور بے سہارا عوام کو گاہے بگاہے تلوار کی گھاٹ اتارتا ہے۔ شہروں میں اگر اقلیتی طبقوں کے عوام کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے تو دیہات میں ہر غریب اور کمزور کسان بلا لحاظ مذہب اور ملت اُن کے خون کے پیاسے

بھیڑیوں کی ہوس کا شکار ہے۔ ہمارے سماج پر قاتلوں، اسمگلروں، اور بلیک مارکیٹوں کا غلبہ ہوگیا ہے۔ جبلپور سے لے کر رانچی تک جو یکطرفہ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا ہے اس نے ملک کے امن و امان کو ہی چیلنج نہیں کیا ہے بلکہ جمہوری طرزِ حکومت کو اور آئین کی حکمرانی کو بھی مسترد کردیا ہے۔

"آج ماتم اردو کا نہیں بلکہ انسانیت کا ہے، جو اس ملک سے رخصت ہو رہی ہے۔ غم صرف ان بے کس عورتوں اور بچوں کا نہیں ہے جنھیں انسان کے روپ میں درندوں نے رات کے اندھیروں میں چیر پھاڑ ڈالا بلکہ اس جمہوریت کا ہے جو قدم قدم پر دم توڑ رہی ہے اور جس کے آخری سہارے بھی ڈانوا ڈول ہیں۔ آج اچاریہ ونوبا بھاوے اور شری جے پرکاش نرائن جیسے مقتدر رہنما بھی مشعلِ راہ بننے کی جگہ گردِ کارواں بن گئے ہیں۔ اب لیڈرشپ کا معیار یہ نہیں رہا ہے کہ عوام کو غلطیوں کی نشاندہی کی جائے اور صحیح راستے کو سمجھا دیا جائے۔ بلکہ انتشار اور تباہی کے جس راستے پر عوام چل رہے ہیں اسی کو تقدس کا درجہ عطا کردیا گیا ہے۔

"مہاتما گاندھی نے حق اور صداقت کے لئے اکیلی آواز اٹھانے کا جو عزم عملی دکھایا تھا ان کے بڑے بڑے چیلے اس سے بالکل محروم نظر آتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی اہنسا نے ملک کو انگریز کی سامراجی طاقت سے بےخوف کردیا تھا۔ آج تشدد کے ملک گیر مظاہروں نے ہمارے عوام پر خوف و ہراس مسلط کردیا ہے جو ہماری آزادی کے لئے چین اور پاکستان سے بھی کہیں بڑا دشمن ثابت ہوگا۔"

(دسمبر ۱۹۶۷ء)

مسلم بنگال کا المیہ

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی سالہا سال کی جدوجہد کے بعد ۱۹۰۵ء عہد لارڈ کرزن میں بنگال کی تقسیم ہوئی تھی اور اُس وقت مسلمانوں کے حصہ میں جو بنگال آیا تھا وہ بلحاظ رقبہ موجودہ مشرقی پاکستان سے قریب قریب دوگنا تھا۔ لیکن ہندوؤں کی سازش اور انگریز حکمرانوں کی بزدلی و دغابازی کی بناء پر ۱۹۱۱ء میں مذکورہ تقسیم بنگال منسوخ ہو گئی، ۳۶ سال بعد ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی بدولت دوبارہ بنگال کی تقسیم ہوئی اور مسلم بنگال کو ہندو بنگال ہو گیا۔ ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

مشرقی پاکستان میں جو ہولناک واقعات پیش آئے اور جو عبرتناک انجام ہوا اس کے بڑی حد تک ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ہم نے پورے چوبیس سال ضائع کئے۔ مشرقی پاکستان کی قریب چھ کروڑ آبادی میں ایک کروڑ کے لگ بھگ غیر بنگالی تھے۔ جن کو وہاں

عرفِ عام میں 'بہاری' 'پنجابی' یا 'مہاجر' کہا جاتا تھا۔ ان آخر الذکر غیر بنگالیوں میں بھی دو طبقے تھے۔ ایک غریب و نادار اور دوسرا مالدار' غریبوں کی زبوں حالی' بے سرو سامانی اور کسمپرسی ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ مغربی پاکستان میں غریب عوام کی ہے۔ صاحبِ ثروت طبقے کو ایک مضبوط پشتیبان کا رُول ادا کرنے کے بجائے صرف دولت کمانے سے کام تھا۔ اس نے کبھی بھول کر بھی یہ نہ سوچا کہ اس نئے خطۂ ملک میں جو قریب پچاس سال کی قربانیوں کے بعد ازسرِنو حاصل کیا گیا ہے' مضبوط سے مضبوط تر بنائیں۔ چونکہ مشرقی پاکستان کی زرخیزی مسلّم تھی اور مزدور بھی ارزاں دستیاب تھے لہذا دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹ کھسوٹ کی گئی۔ غریبوں کی مفلوک الحالی دور کرنے یا ملکی و قومی مفاد میں کچھ ٹھوس تعمیری کام کرنے کی مُطلق توفیق نہ ہوئی!

ڈھاکہ اور چاٹگام میں بکثرت بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر عوام کے مسائل' ان کی خوش حالی اور قومی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ انھوں نے آنکھیں بند کر کے عوام کو نظر انداز کیا۔ ان کی امنگوں کو اہمیت نہ دی اور اپنی جلبِ منفعت کی خاطر عوام میں اس درجہ احساسِ کمتری پیدا کیا کہ وہ اپنے احساسات و جذبات سے محروم ہو کر صرف اُسی راہ پر گامزن ہو گئے جو انھوں نے ان کے لئے متعین کی تھی اور

جس کا نتیجہ قومی حیثیت سے سوائے تباہی کے کچھ نہ تھا۔

علمی حیثیت سے بھی جو تدبیریں کارگر ہو سکتی تھیں ان پر توجہ نہیں کی گئی۔ مشرقی پاکستان میں بکثرت اسلامی مدارس و مکاتب جن میں ذریعہ تعلیم اُردو تھا مسلسل بے اعتنائی کا شکار رہے۔ "انجمن ترقی اُردو مشرقی پاکستان" اور "انجمن حروف القرآن" وغیرہ اداروں کی بھی صاحبِ ثروت مہاجر صنعت کاروں یا کاروباری اصحاب نے مدد نہیں کی جس کے نتیجہ میں ہندو کلچر اور مسلم بنگلہ کا ہندی رسم الخط بڑی سرعت سے فروغ پاتا رہا۔ تا آنکہ ہندو دیو مالا پڑھے ہوئے مشرقی پاکستان کے نوجوان اور عوام اسلامی علوم، اسلامی اقدار، اسلامی اتحاد اور متحدہ پاکستان کے تصور و نصب العین سے دور ہو گئے۔ اس ثقافتی اور لسانی بُعد نے جیسی کچھ قیامت برپا کی وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ اور درمیان میں دشمن جانی بھارت کا وجود اس امر کا متقاضی تھا کہ قومی اتحاد و یکجہتی کی خاطر لسانی، ثقافتی اور مذہبی اقدار کو زیادہ فروغ دیا جاتا۔ مگر افسوس ہے کہ ان ہی چیزوں کو نظر انداز کیا گیا اور صرف اقتصادی و سیاسی مسائل پر ہی ہماری تمام تر توانائیاں صرف ہوتی رہیں۔

عوامی لیگ کی تحریک اگر صرف سیاسی اور اقتصادی حق تلفیوں

کو دور کرانے تک، محدود رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن مسلم بنگال کے بجائے "پوربو پاکستان" اور "بنگلہ دیش" کے نعروں نے تو نخلِ آرزو کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی۔ اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کے نتیجہ میں جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو اُس وقت بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں اور تلافیٔ مافات کے لئے ہم نے کوئی ہوشمندانہ قدم نہ اٹھایا۔ غضب یہ کہ مثبت کے بجائے منفی طرزِ فکر و عمل کو اپنایا گیا۔

ہمارے سابق حکمراں دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بارے میں کچھ اس طرح سوچتے تھے کہ منجملہ دس بارہ پارٹیوں کے ایک عوامی لیگ بھی ہے اور الیکشن کے نتیجہ میں حصہ رسدی کچھ سیٹیں اس کو بھی مل جائیں گی۔ اسی لئے عام دستور کے برعکس "لیگل فریم ورک آرڈر" میں یہ تحفظ تک نہ رکھا گیا کہ کانسٹی ٹیوشن ۲/۳ اکثریت سے پاس ہوگا۔ اسی طرح عوامی لیگ کے چھ نکات کے مضمرات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی گئی اور ان کو پروان چڑھنے کا بھرپور موقع دیا گیا۔ لیکن جب ان چھ نکات کی بنیاد پر عوامی لیگ کو زبردست کامیابی حاصل ہوگئی اور قریب قریب سو فیصد اس کے امیدوار کامیاب ہوگئے تو عام گھبراہٹ پھیل گئی اور حکمراں جماعت یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ جس طرح بھی ہو شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ کو برسرِ اقتدار آنے نہ دیا جائے۔ یہی طرزِ عمل مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ملک کے

دونوں بازوؤں کے منتخب نمائندوں کو بروقت اقتدار منتقل نہ ہو سکا۔ محرومی اقتدار کو مغربی پاکستان کے لوگوں نے تو حسب روایتِ قدیم برداشت کر لیا لیکن مشرقی پاکستان کے لوگ قابو سے باہر ہو گئے۔ جن سے نبٹنے کے واسطے ڈنڈے کے زور سے حکومت چلانے کی کوشش کی گئی۔ مگر ناکامی ہوئی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۳؍مارچ ۱۹۷۱ء سے پہلے حالات کو اس قدر بگڑنے کا موقع ہی کیوں دیا گیا؟ جبکہ فوج بھی موجود تھی اور پورا نظامِ حکومت بھرپور طریقے پر قائم تھا۔ مشرقی پاکستان کے گورنر احسن اور خود صدرِ پاکستان گورنمنٹ ہاؤس ڈھاکہ میں عام کشت و خون اور شدید بد امنی کا تماشہ بیٹھے دیکھتے رہے۔ اس موقع پر ہم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی جرأت و بہادری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انتہائی خطرناک فضا میں وہ اصلاحِ حال کے لئے بار بار ڈھاکہ پہنچے اور آخر میں نوبت بانیجا رسید کہ ان کی قیامگاہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل سے پریسیڈنٹ ہاؤس تک آنے جانے کے لئے فوج کے مسلح نوجوانوں کو اُن کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ حد یہ کہ مسٹر بھٹو ۲۵؍مارچ کے بعد بھی جبکہ صدر یحییٰ اور ان کے مشیر پہلے ہی وہاں سے چلے آئے تھے ڈھاکہ میں ٹھہرے رہے۔ اس وقت حکومت کی طرف

سے فوجی کارروائی بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہایت بد دلی سے اور ادھوری کی گئی۔ بالخصوص جنرل ٹکا خاں کو ہٹا کر جس طرح ڈاکٹر مالک کو گورنری سونپی گئی۔ اس کا جواز آج تک سمجھ میں نہ آیا۔ پھر جنگ چھڑ گئی اور جنگ میں درد انگیز تباہی مچنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں ہماری حکومت کافی تعداد میں جنگی ہوائی جہاز نہ بھیج سکی۔ اور ہماری بہادر افواج کو معقول ہوائی تحفظ نہ ملنے کی وجہ سے صرف دفاعی جنگ لڑنا پڑی۔ اگر مشرقی پاکستان میں ہمارا ہوائی بیڑہ کافی موثر ہوتا تو نہ صرف دفاع زیادہ مضبوط ہوتا بلکہ کلکتہ تک کو تباہ کیا جا سکتا تھا۔

۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء سے جنگ کے شعلوں نے مغربی پاکستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور یہاں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے برعکس جس طرح کا دفاع ہوا وہ بھی ہم سب کے سامنے ہے۔ ——— جو نتیجہ ہے ایک دوسری بڑی غلطی کا کہ جس طرح روس اور بھارت کا پیکٹ ہوا اس قسم کا ہمارا پیکٹ کسی بھی بڑی طاقت سے نہ تھا۔

بہرحال "گذشتہ انچہ گذشت" سابقہ حکمراں ہر طرح کی تباہی مچانے کے بعد اب رخصت ہو چکے ہیں۔ اور ملک کی قیادت خود عوام اور ان کے نمائندوں کے ہاتھوں میں آچکی ہے۔

ابھی ہم ان اقدامات و اصلاحات کے بارے میں کچھ نہ کہیں گے جو نہایت قلیل مدت میں رونما ہوئی ہیں۔ توقع ہے کہ جلد از جلد عظیم قومی نقصانات کی کما حقہٗ تلافی ہو جائے گی۔ اور ہمارا ملک از سرِ نو اقوامِ عالم کی صفِ اول میں سربلندی و افتخار حاصل کر لے گا۔

سیاست اور صحافت میں کوئی شخص یا ادارہ کسی ایک رائے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات پہلے کہی ہوئی بات کے بالکل برعکس اظہارِ رائے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ رائے اور عمل کا تضاد سیاست میں روزمرہ کا کھیل ہوتا ہے۔ کل کا دشمن آج کا دوست۔ اور آج کا دوست کل کا دشمن ہو جائے تو کوئی کیا کرے۔ بالکل خاموشی اختیار کرنا بھی ممکن نہیں ہو سکتی۔

۷ اور ۸ جنوری کی شب میں پاکستان کے صدرِ محترم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن صاحب کو حسبِ وعدہ باعزت اور غیر مشروط طور پر رہا کر کے راولپنڈی سے رخصت کر دیا۔ اور شیخ صاحب نے جیسی کہ اُن سے توقع تھی لندن پہونچتے ہی اپنے "بنگلہ دیش" کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سے جو کچھ ہو رہا ہے سخت الم انگیز اور عبرت ناک ہے۔

بہرحال! اب فوری قابل توجہ کام یہ ہے کہ مغربی پاکستان کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا جائے۔ ہر قسم کے صوبائی نسلی اور لسانی اختلافات کا ہمیشہ کے واسطے سدِ باب کیا جائے، اپنے ملک کے دفاع کو ہر قیمت پر ناقابلِ تسخیر بنایا جائے مخلص و دیانت دار حکمراں جماعت کے ہاتھ بغیر تحفظ ذہنی مضبوط کئے جائیں۔ اور ہر فردِ ملت قطع نظر اس سے کہ اس کا کس مکتبۂ فکر سے تعلق ہے۔ پاکستان کی بقا کے لئے بے لوث خدمت میں لگ جائے۔ ملکوں اور قوموں پر اس قسم کے نازک دور آتے رہتے ہیں۔ مگر عزم محکم صبر و استقلال اور دلیری و بہادری کی بدولت سب مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔ ؎

چشمۂ آب ہو تم سوتے ہو کیوں زیرِ زمیں
سنگِ خارا کے شگافوں سے اُبلنا سیکھو

۱۰ر جنوری ۱۹۷۲ء

ادبیات

ایک ملت۔ ایک زبان

۱۹۲۵ء میں دارالعلوم علی گڑھ کی پنجاہ سالہ طلائی جوبلی کے موقع پر ایک وفد افغانستان سے وہاں کے وزیر تعلیم کی قیادت میں آیا تھا۔ وزیر موصوف ایک سجیلے خوش شرو اور خوش بیان آدمی تھے۔ معلوم ہوا کہ انگلستان کے تعلیم یافتہ اور کئی یوروپین زبانوں کے ماہر ہیں لیکن متعدد بار جب ان کی تقریریں ہوئیں تو وہ فارسی میں بولے۔ ہماری طرف سے انگریزی میں ایڈریس دیا گیا اور انہوں نے فارسی ہی میں جواب دیا۔ اسی طرح یہاں کراچی میں موتمر عالم اسلامی شعوب المسلمین اور احتفال العلماء کے اجلاس ہوئے۔ مصر۔ ٹیونس۔ الجیریا۔ شام۔ سعودی عرب۔ عراق۔ ایران اور انڈونیشیا وغیرہ ہر ایک ملک کے نمائندوں نے اپنے اپنے ملک کی قومی زبان میں تقریریں کیں۔ چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔

ان مواقع پر پاکستان کے نمائندے کسی ایک زبان کے پابند نہ تھے۔ وزرائے کرام کی تقاریر انگریزی میں تو مولوی حسن الاعظمی اور مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی عربی اور اُردو میں بولتے تھے۔ ملت پاکستان کی کوئی ایک زبان ہی نہ تھی جس کو وہ ملی فخر کے ساتھ ذریعہ اظہار بناتے۔

جس طرح اسلامی عہد حکومت میں ہندو رعایا فارسی دانی اور اس کو افہام و تفہیم کا ذریعہ بنانا بڑی بات سمجھتی تھی۔ اسی طرح قریب ڈیڑھ سو سال سے

مسلمانوں نے اپنے انگریز حاکموں کی زبان انگریزی کو ذریعہ اظہار بنا کر اس کو حد درجہ تفاخر کی چیز سمجھا اور اگرچہ آزادی کو حاصل ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے لیکن ہم ابھی تک اپنے آپ کو زیرِ سایۂ برطانیہ عظمیٰ سمجھتے ہیں۔ اور اس کی زبان۔ لباس اور معاشرت کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہیں۔

ایک لالہ جی کا قصہ مشہور ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے لیکن جب مندر کے پاس سے گذرتے تو اس میں رکھی ہوئی مورتی کو بھی پرنام کر لیتے۔ کسی نے کہا اجی یہ کیا کرتے ہو؟ تو ان لالہ جی نے کہا۔ بھیا رے! کسی سے بگاڑا چھا نہیں۔ کیا معلوم کبھی ان سے بھی کام پڑ جائے۔

آزاد ہوتے ہی انڈونیشیا والوں نے ڈچ کو، برما والوں نے انگریزی کو، شام والوں نے فرانسیسی کو چھوڑ دیا۔ مگر اپنی آزادی پر ہمارا "یقین محکم" ملاحظہ ہو کہ ہم ابھی تک انگریز کا انگریزی میں خواب دیکھتے ہیں۔

دور نہ جایئے پاکستان میں مختلف ممالک کے سفارت خانے موجود ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ملکی و قومی زبان میں اپنا اپنا کاروبار چلا رہا ہے اور کسی دوسری طاقت کی خوشنودی یا اس کی سہولت کی غرض سے اپنی زبان کو ترک نہیں کرتا۔ کیونکہ قومی جھنڈے کی طرح اپنی قومی زبان بھی قومی غیرت و حمیت اور ملکی آزادی کا ایک امتیازی نشان ہوتی ہے۔

ہمارا اوڑھنا بچھونا انگریزی ہے حالانکہ دورِ غلامی کی دو سو سالہ جدوجہد کے باوجود ہماری آبادی کا صرف دو فی صدی انگریزی داں ہو سکا ہے اور اگر ہم اسی ولایتی زبان کو ذریعہ نجاتِ دنیوی سمجھتے رہے تو ساڑھے چھ ہزار

سال میں کہیں ہم پورے انگریز یا امریکی بن سکیں گے۔ آج ایران کے تمام سرکاری محکموں حتیٰ کہ ایرانی اور غیر ملکی بنکوں تک کو فارسی میں اپنا کاروبار چلانا پڑتا ہے۔ یہی حال شام۔ برما اور انڈونیشیا وغیرہ کا ہے۔

ہمیں اپنے ملک کے کالے پیلے، چپٹے اور بے ہنگم ڈیل ڈول کے آدمی انگلستان۔ امریکہ اور دوسرے یورپین ممالک کے گورے چٹے خوبصورت آدمیوں کے مقابلہ میں پسند ہیں۔ اپنے یہاں کے بے آب وگیاہ ریگستان، چٹیل میدان اور بنجر پہاڑ۔ اسکاٹ لینڈ۔ سوئٹزرلینڈ اور کیلیفورنیا کے مرغزاروں کے بہ نسبت زیادہ عزیز ہیں۔ اسی طرح ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ غیر ملکی زبانوں کے مقابلے میں اپنی ملکی زبان بدرجہا زیادہ محبوب ہے۔

ایک غیر ملکی زبان کے اختیار کرنے کا انجام وہی ہوتا ہے جو انگریزی کی بدولت ہوا کہ اس کو انگریزی اقتدار کے زمانے میں بھی دو فی صدی سے زائد لوگ نہ سمجھ سکے۔ یا اس سے پہلے فارسی کا ہوا کہ آج اس کے جاننے والے ایک فی دس ہزار بھی موجود نہیں ہیں۔ لہذا زبانوں کی پسند کے معاملہ میں اولیت کا درجہ صرف اپنی قومی زبان کو حاصل ہے اور اس کا یہ مقام لازوال ہے۔

قومی زبان کی مندرجۂ بالا اہمیت کے پیشِ نظر ہم اس امر کے پُر زور منادی ہیں کہ ہم کو بلا تاخیر کسی بھی غیر ملکی زبان کے مقابلہ میں اپنی قومی زبان کو ہی پاکستان کی سرکاری ودفتری زبان بنانا چاہیے۔ اور حکومت کے تمام ذرائع ووسائل کو کام میں لا کر اس کو اس قدر ترقی دینا چاہیے کہ وہ جلد از جلد دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں آجائے۔

قیامِ پاکستان سے قبل پاک و ہند کے تمام صوبوں کے مسلمان اُردو کی ترقی میں حصہ لے کر اس کو اپنی قومی زبان تسلیم کر چکے تھے۔ تفصیل سے قطعِ نظر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سے تقریب پون صدی تک مُسلم قوم کی تمام تعمیرِ ملّی کی تحریکات اور اداروں کا کاروبار اُردو میں چلتا تھا۔

مسلم لیگ اور قیام پاکستان کی ساری جدّوجہد بھی ملک کے گوشہ گوشہ میں اُردو کے ذریعہ ہوئی لیکن ہمارے کسی بنگالی یا سندھی بھائی نے نہ کبھی کوئی اعتراض کیا اور نہ یہ مطالبہ کیا کہ بنگالی اور سندھی وغیرہ کو بھی استعمال کیا جائے۔ سر سید علیہ الرحمتہ، نواب محسن الملک اور ان کے جانشینوں نے پچاس سال تک ہندی کے مقابلہ میں تحفظ اُردو کی جو مہم چلائی اس کو کراچی سے ڈھاکہ اور پشاور سے مدراس تک مسلمانوں کی تائید حاصل رہی۔

برصغیر پاک و ہند سے باہر کی دُنیا میں نہ کوئی ہندی کو جانتا ہے اور نہ بنگلہ اور مرہٹی وغیرہ کو۔ ممالک اسلامیہ۔ ممالک یورپ۔ مشرق بعید اور امریکہ وغیرہ میں سب جگہ اُردو ہی چلتی ہے ہز رائل ہائی نس آغا خان کی خود نوشت سوانحِ حیات جو کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے اُس میں آپ نے لکھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ ملکہ وکٹوریہ کے حضور میں حاضر ہوئے تو رخصت کے وقت ملکہ نے اپنے قلم سے لکھی ہوئی اُردو کی ایک تحریر آپ کو دی۔

اسی طرح ایڈورڈ ہشتم ۱۹۲۲ء میں بحیثیت پرنس آف ویلز ہندوستان کے طویل دورہ کے لئے روانہ ہوئے تو ان کو نہایت تاکید کے ساتھ اس قدر اُردو سکھائی گئی کہ وہ چھوٹی چھوٹی تقریریں کر سکیں۔ جارج ششم آنجہانی نے بھی

ایک مرتبہ لندن میں اے۔ آر۔ پی کے دستہ کا معائنہ کیا اور سلامی لی تو ایک سکھ سردار رام سنگھ کے پاس سے گزرتے ہوئے اُردو میں فرمایا۔

"کیوں سردار جی! اچھے ہو؟"

پچھلی جنگ عظیم میں جس وقت ہٹلر کا حملہ انتہائی شدت اختیار کئے ہوئے تھا اور فرانس کا خاتمہ آناً فاناً ہونے والا تھا تو پیرس سے مسٹر چرچل نے لارڈ اسمے کو جو پیام لندن بھیجا وہ اُردو میں تھا۔

اپنے زمانہ حکومت میں برٹش گورنمنٹ انگریز فوجیوں اور آئی۔ سی۔ ایس کے لوگوں کو عام اس سے کہ ان کا تقرر بنگال میں ہو۔ دکن میں ہو یا سندھ و سرحد میں لازماً اردو سکھا کر بھیجتی تھی۔

انگریزوں نے مغلوں سے جب حکومت لی تو فارسی کے بجائے اُردو کو سارے ملک کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر کی زبان بنایا۔ اور انگریز افسروں کو اُردو سکھانے کے لئے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم کیا جس کے نتیجہ میں مغربی بنگال میں کلکتہ اور مرشد آباد اور مشرقی بنگال میں ڈھاکہ اُردو زبان کی ترقی و اشاعت کے بہت بڑے مرکز بن گئے۔ اُردو کے بنگالی شاعر اور ادیب پٹنہ عظیم آباد۔ لکھنؤ اور دہلی کے شعراء سے برابر کی ٹکر لینے لگے۔

قرآن شریف کا سب سے پہلے اُردو ترجمہ حکیم شریف خاں دہلوی نے کیا اس کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب و شاہ رفیع الدین صاحب نے اُردو میں کلام پاک کے ترجمے کئے۔ حدیث و فقہ کی مستند کتابوں اور جملہ اسلامی علوم و فنون کی ہزارہا کتابیں اُردو میں اس قدر بڑے پیمانہ پر منتقل ہوئیں کہ

خیر و برکت کے لئے قرآن شریف ناظرہ پڑھنے کے سوا مذہبی معلومات کے لئے عربی سے بالکلیہ بے نیازی ہو گئی۔ اس وقت تک اُردو کی ایک لاکھ سے زائد کتابیں طبع ہو چکی ہیں جن میں سے تقریباً ۳۵ ہزار انجمن ترقی اُردو کے کتب خانۂ کراچی میں موجود ہیں۔ ابتدائی نوشت و خواند سے لے کر یونیورسٹی کے ہر ایک مضمون کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم اُردو میں دئے جانے کے کامیاب ترین تجربے ہو چکے ہیں۔ الغرض اُردو کی وسعت و ہمہ گیری اور اس کی ترقی کی خداداد صلاحیت پر کہاں تک دلائل و براہین پیش کئے جائیں اس کی مثال "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کی سی ہے لہذا پاکستان کے تمام دور اُفتادہ علاقوں میں رشتۂ اتحاد و یگانگت۔ بھارت کے سات کروڑ مسلمانوں سے بھائی چارہ اور پانچ کروڑ آبادی کے عرب ممالک سے رابطۂ محبت قائم رکھنے کے لئے اُردو اور صرف اُردو کو پاکستان کی قومی و سرکاری زبان کا ناگزیر درجہ ملنا چاہئے۔ رہا یہ سوال کہ وہ کسی علاقہ کی مادری زبان نہیں ہے تو یہ ایسی ہی چھوٹی بات ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ چونکہ مرزا غالب میٹرک پاس نہیں تھے لہذا ہم ان کو بڑا شاعر نہیں مانتے۔

(جون ۱۹۵۴ء)

پاکستان میں لسانی مسئلہ

پاکستان میں لسانی مسئلہ کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اُردو کی ترقی و ہمہ گیری کسی بھی فرد یا جماعت کی رہینِ منت نہیں ہے۔ اب سے چند سو سال پہلے مختلف اللسان لوگوں کا جب ہندوستان میں اجتماع ہوا تو باہمی افہام و تفہیم کی ضرورت نے اس مشترک زبان کو جنم دیا۔ اور رفتہ رفتہ بکثرت علماء۔ ادباء اور شعراء کی سعی سے اس نے ایک اصلی درجہ کی علمی و ادبی زبان کی حیثیت اس برصغیر میں اختیار کرلی۔ نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ غیر ممالک میں بھی ہمارے یہاں کی کوئی سی بھی علاقائی زبان اردو کے سوا بولی اور سمجھی نہیں جاتی۔ اور اب وہ دُنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔

اُردو کو کسی علاقہ سے وابستہ کیا جانا اس کی توہین ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ غالب کے متعلق کہا جائے کہ وہ میٹرک پاس تھے یا نہیں؟ اُردو اتھاہ سمندر کے پانی اور فضائے بسیط میں چلنے والی ہوا کی طرح ایک لامحدود زبان ہے اور اس کا فروغ بالکل فطری تقاضوں کے تحت ہوا ہے۔ اور آنے والا وقت بھی اس کی لسانی اہمیت و افادیت کو نظرانداز نہ کرسکے گا۔

اب رہی اُردو کی ہر چہار جانب سے مخالفت تو اس میں غیروں سے زیادہ خود ہمارا قصور ہے۔ مثلاً بنگال کے طول و ارض میں تقسیم ملک سے

پہلے اور اس کے کافی عرصہ بعد تک اُردو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی نیز فروغِ ادبِ اُردو کے بڑے بڑے مراکز بھی وہاں موجود تھے لیکن ہم جیسے بزعمِ خود اُردو کے ٹھیکہ داروں نے اپنی غفلت سے اس خوشگوار صورتِ حال کو قائم نہیں رہنے دیا۔ اُردو کی توسیع واشاعت کے لئے ہم ان مقامات پر جم کر بیٹھے جہاں اس کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے ہم نے اپنی بے تدبیری سے اُردو اور بنگالی کے ایک ایسے محاذ کو ابھرنے کا موقع دیا۔ جیسا کہ قیامِ پاکستان سے پہلے اُردو اور ہندی کا تھا۔ ڈھاکہ میں عرصہ دراز سے انجمن ترقی اُردو کا دفتر قائم تھا میں نے بارہا اس عمارت کے پاس سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ ساٹھ ستر لاکھ مشرقی پاکستان میں مقیم مہاجرین میں سے کوئی بھی تو وہاں نہیں جاتا تھا۔ انجمن کا بورڈ ٹیڑھا لٹکا ہوا تھا کبھی کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ اسے سیدھا کر دے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہزارہا بنگالی طالب علم ہر سال دیوبند۔ سہارنپور میرٹھ۔ لکھنؤ۔ دلی۔ رام پور۔ بریلی۔ مراد آباد۔ اور پٹنہ وغیرہ سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن واپس جاتے تھے اور اپنے اپنے گاؤں اور قصبات میں دینی تعلیم کے مدرسے قائم کرتے تھے۔ جن میں ذریعہ تعلیم اُردو ہوتا تھا۔ ایسے لاتعداد مدارس سرزمین بنگال کے گوشہ گوشہ میں قائم ہوئے لیکن مجھے یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی ارباب حکومت کی جانب سے خاطر خواہ سرپرستی، ہمت افزائی یا امداد نہیں کی گئی۔ اُردو کے مشہور شاعر اور نقاد جناب فضل احمد کریم فضلی عرصہ تک مشرقی پاکستان گورنمنٹ

کے سکریٹری ایجوکیشن رہے۔ جناب جی۔ اے مدنی صاحب بھی ایجوکیشن سکریٹری مشرقی پاکستان کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے لیکن میں ان حضرات سے پوچھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں متذکرہ اردو۔عربی مدارس کے لئے کیا کیا۔؟

میری تلخ نوائی معاف۔ مغربی پاکستان میں یہ صورت رہی کہ عرصہ دراز تک دلی۔ لکھنؤ۔ الہ آباد۔ اعظم گڑھ جیسے اردو کے علاقوں سے آئے ہوئے اعلیٰ عہدیدار افسران سیاہ و سپید کے مالک رہے۔ لیکن باستثنائے چند سب اپنی اپنی ذاتی خود غرضیوں میں مبتلا ہو کر اپنی قوم اور قومی زبان سے قطعاً غافل ہو گئے۔ اور اب جبکہ ان میں سے اکثر اسکریننگ میں آکر اقتدار سے محروم ہو چکے ہیں۔ تو تنہا ان کی محرومی نہیں ہے بلکہ آئندہ کے لئے یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا کہ بھارتی علاقوں سے آئے ہوئے لوگ پھر کبھی ایسے اونچے عہدوں پر دوبارہ فائز ہو سکیں گے۔ ہمارے اپنے اعلیٰ افسران کی یہ ذہنیت بھی میرے اور آپ کے مشاہدہ میں آئی ہو گی کہ اگر ان کو کسی ضرورت سے اردو میں خط لکھا جائے تو وہ بد تہذیبی خیال کی جاتی تھی۔ اور اس کا جواب تک نہیں ملتا تھا۔ ملاقات کی جائے تو اردو میں گفتگو کرنا گھٹیا پن خیال کیا جاتا تھا۔

آخر میں ایک اور تکلیف دہ صورت حال پر بھی غور کیجئے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اردو کی کتاب یا رسالہ ایک ہزار سے زائد نہیں چھپ پاتا۔ اس کے بھی دس دس سال تک فروخت ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ لاتعداد کتابیں چھپنے کی

سرے سے نوبت ہی نہیں آتی۔ کیونکہ لکھنے والوں کے پاس پیسہ نہیں اور کوئی دوسرا اس کو چھپوانے کے فضول کام میں روپیہ کیوں خرچ کرے؟

ہمارا سب سے بڑا اُردو کا فدائی اور پرستار کتاب خرید کر پڑھنا گناہ عظیم سمجھتا ہے۔ حد یہ ہے کہ کسی مفید کتاب کو کسی نہ کسی طرح چھاپ کر مفت بھی تقسیم کر دو تو اس کو پڑھنے کی کسی کو فرصت نہیں۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے دیہات میں ہم نے اُردو کا کتنا لٹریچر پہنچایا اور کس قدر اُردو کے مدرسے اور مکتب قائم کیے۔ خلاصہ یہ کہ سیاسی اغراض و مصالح کے تحت ہم اُردو کے سوال کو بطورِ اسٹنٹ تو استعمال کرتے ہیں لیکن حقیقی اور ٹھوس کام سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو کے معاملہ میں آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ اور ہماری اُردو زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

(مارچ ۱۹۷۱ء)

انتقادیات

افریقہ ایک چیلنج

جناب احمد عبداللہ المسدوسی کی یہ معرکۃ الآرا کتاب "افریقہ ایک چیلنج" جس کو مکتبۂ خدام ملت نے ۱۳/۱/اے بلاک نمبر ۳ ناظم آباد کراچی سے شائع کیا ۲۳×۱۸/۸ سائز کے پانچسو سات صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور جس طرح مصنف علام کی اس سے پہلے شائع شدہ تالیف "مذاہب عالم" ایک انتہائی معیاری اور لاجواب کتاب تھی اسی طرح یہ قیمتی تصنیف بھی ہمارے قومی لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ براعظم افریقہ عیسائی طاقتوں سے زیادہ مسلمان فاتحین اور مبلغین کی تگ و تاز کا بہت بڑا مرکز رہا ہے جس کے نتیجہ میں وہاں کی کل آبادی میں ساٹھ فی صدی مسلمان ہیں۔ مسلم اکثریت کا یہ براعظم صدیوں سے مغربی استعمار اور لوٹ کھسوٹ کا ہدف رہا ہے اب سے چند سال پہلے تک اس کا شمار دنیا کے تاریک ترین حصوں میں سے تھا اور کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ اس پسماندہ سرزمین میں بھی زندگی کی کوئی لہر آئے گی۔ ہماری عام معلومات زیادہ سے زیادہ مصر، سوڈان اور شمالی افریقہ کے دیگر ممالک تک محدود تھیں۔ اس کے بعد اگر کوئی تصور تھا تو یہ کہ افریقہ میں بڑے بڑے ریگستان اور گھنے جنگل ہیں جن میں خونخوار درندے کالے کلوٹے وحشی لوگ آباد ہیں۔ جن کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا مقدس فریضہ اقوام یورپ انجام دے رہی ہیں۔

مسدوسی صاحب کی زیرِ تبصرہ مبسوط و محققانہ کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ افریقہ میں پہلے بت پرستی پھر یہودیت اس کے بعد عیسائیت اور آخر میں اسلام کا زبردست دور دورہ رہا اور ان تمام ادوار میں بڑی بڑی تہذیبیں اور سلطنتیں وجود میں آئیں جن کو اپنی ذاتی اغراض کے لئے یوروپین طاقتوں نے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ حدیہ کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں لے جا کر ان پر نسلاً بعد نسلٍ انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے لیکن اب ایک ایک کر کے افریقہ کے تمام ممالک آزاد ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں جن میں مسلمانوں کا حصہ غالب ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر عالم اسلام کا افریقہ کی طرف متوجہ ہونا اسلام کی سربلندی کے لئے ناگزیر ہے۔

مسدوسی صاحب کی یہ کتاب مکمل گائڈ بک ہے جس میں ہر قسم کا سیاسی، معاشرتی، تمدنی، زرعی اور معدنیاتی معلومات کا قیمتی مواد یکجا کیا گیا ہے۔ کوئی بات بغیر سند اور اعداد و شمار کے پیش نہیں کی گئی ہے ساتھ کے ساتھ توضیح مطالب کے لئے معلومات افزا نقشے اور گوشوارے وغیرہ کثرت و بہتات کے ساتھ شامل کتاب کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے جس قسم کے تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں، ان جیسے دس مقالوں پر یہ کتاب بھاری ہے۔ اندازِ بیان سلجھا ہوا اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ مصنف کا جذبۂ اسلامی و ملی قدم قدم پر ظاہر و باہر ہوتا ہے۔ یہ قیمتی کتاب ہر ایک کتب خانہ اور پڑھے لکھے گھر میں موجود ہونی چاہیئے۔ قیمت صرف بارہ ۱۲ روپے ہے جس سے کتاب کی لاگت کا

شاید ایک چوتھائی روپیہ بھی ناشر کو وصول نہ ہو سکے گا۔ ہم خلوص دل سے جناب احمد عبداللہ المسدوسی صاحب کے بے مثل ایثار اور ان کی نہایت کامیاب تصنیفی اور ملّی خدمت کو سراہتے ہیں۔

(جون سنہ ۱۹۶۲ء)

کچھ "العلم" کے بارے میں

"العلم" آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا سہ ماہی آرگن ہے اور ایک باوقار علمی و تعلیمی ادارے کے شایانِ شان جولائی سنہ ۱۹۵۱ء سے جاری ہے۔ اس میں نہ افسانے ہوتے ہیں نہ غزلیں اور نہ تجارتی اشتہار۔ جہاں تک اس کی پالیسی کا تعلق ہے نہایت اچھوتی میانہ وری کے باعث گذشتہ برسوں میں اس کے خلاف سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر کبھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔

باعتبار عقائد مسلمانوں میں جو روایتی ۷۲ فرقے ہیں ان پر مستزاد ہم چونکہ ایک تہترویں ۷۳ فرقے "علی گڑھ تحریک" کے پیرو ہیں جس کی اصل روح :-

صلح کل ——— اور

کسے را با کسے کارے نباشد

ہے لہٰذا اس خصوص میں بھی نہ تو ہم کسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا ہمارے اعمال و افکار کا نوٹس لیتا ہے۔

حکومت کے معاملہ میں عرض ہے کہ ہمہ وقت صرف "کانفرنس اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ" اور "سر سید گرلس کالج" کا مفاد ہمارے پیش نظر رہتا ہے۔ لہٰذا جو اربابِ حکومت ان اداروں کے ہمدرد ہوتے ہیں وہ ہمارے ممدوح اور جو ان سے اغماض برتتے ہیں ان سے ہم صرف بے نیاز رہتے ہیں۔ مخالفت کرنے کی نہ عادت ہے اور نہ فرصت۔ ملی و ملکی فلاح و بہبود کا ایک مقدس مشن ہے۔ جو

ہمیں یقین ہے کہ جتنا ہمیں عزیز ہے اتنا ہی مملکت کی انتظامیہ کو ہے۔

لیکن اس ہمہ جہت خیر سگالی کے باوصف سوئے اتفاق سے ہم "العلم" کے سلسلہ میں ایک چکّر میں پڑ گئے۔

جولائی تا ستمبر ۱۹۶۴ء کا پرچہ شائع کرنے کے بعد اس عالم میں کہ اگلے پرچے کے قریب قریب تمام مضامین کی کتابت ہو کر ان کے پروف بھی آ گئے تھے مطبع نے اطلاع دی کہ ڈکلیریشن کی تجدید کا حکم آیا ہے۔ ہوا یہ کہ ازروئے پریس آرڈیننس ہم نے فروری ۱۹۶۱ء میں تجدید مذکور کے لئے درخواست دے دی تھی۔ اور سی۔ آئی۔ ڈی کی تحقیقات اور رپورٹ کے بعد، جولائی ۱۹۶۲ء کے اخبار "ڈان" میں جن منظور شدہ اخبارات و رسائل کی فہرست شائع ہوئی تھی اس میں 'العلم' بھی شامل تھا۔ جس پر ہم غلطی سے مطمئن ہو گئے۔ مگر اب بتایا گیا کہ نیا ڈکلیریشن فارم بھی اس وقت داخل کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس فروگذاشت کا علم ہوتے ہی ہم نے ۱۵ ردسمبر ۱۹۶۴ء کو معذرت خواہی کی درخواست پیش کر دی جو ڈی۔ ایم۔ آفس سے چل کر سی۔ آئی۔ ڈی آفس، سنٹرل انٹیلی جنس بیورو۔ اور ڈائرکٹر صاحب تعلقاتِ عامہ کے یہاں سے منزل بہ منزل گذرتی ہوئی بالآخر فروری ۱۹۶۵ء کی کسی شروع تاریخ میں ڈی۔ ایم۔ آفس دوبارہ واپس آئی اور ہر چہار محکموں کی قابلِ تعریف مہربانیوں کی بدولت ہمیں ۸ر فروری ۱۹۶۵ء کو 'العلم' کا نیا ڈکلیریشن حاصل ہو گیا۔

اس داستان سرائی کا مقصد ناظرینِ 'العلم' کو اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء کا

زیرِ نظر شمارہ اواخر فروری یا اوائل مارچ ۱۹۶۵ء میں ارسال کئے جانے کی وجہ بتانا تھا۔ نیز یہ معذرت بھی کرنی تھی کہ جب سابقہ پرچہ میں اس قدر تاخیر ہو گئی ہے تو جنوری تا مارچ ۱۹۶۵ء کا ایک پرچہ بھی اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔

لیکن یہ سطور سپردِ قلم کرتے وقت ہمیں ایک اور عجیب تاثر ہوا کہ ناظرین "العلم" سے کسی معذرت اور دعوتِ انتظار کی سرے سے کوئی ضرورت بھی تھی کہ نہیں! یوں تو ہر کلیہ میں استثنا ہوتا ہے لیکن عام طور پر ہمارے خیال میں اس خالص علمی و تحقیقی مجلہ کی حیثیت "ایک ناخواندہ مہمان" کی سی ہے کیونکہ قریب چھ ماہ تک اس کی عدم حاضری کی کسی نے شکایت نہ کی۔ حتیٰ کہ پرچہ کے طلب و تقاضہ کا ایک کارڈ تک نہ آیا اور اس دل شکن کم پرسی کے احساس نے بعض اوقات ہمیں یہاں تک سوچنے پہ مجبور کر دیا کہ جو متذکرۂ بالا قانونی رکاوٹ پیش آئی تھی اس کو دور کرانے کی مطلق کوشش نہ کرتے اور اگر رسالہ بند ہو رہا تھا تو اُسے بند ہی ہو جانے دیتے مگر مجبوری یہ تھی کہ پرچہ ہماری ذاتی ملک نہ تھا۔ ادارہ کا آرگن تھا، اور جب تک ادارہ کا وجود ہے اس کو بے زبان نہ ہونا چاہیے۔

درحقیقت ہمارے قارئین میں جو صاحبِ فضل و کمال ہیں ان کا علم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ انھیں مزید معلومات کی ضرورت نہیں اور جو عام قارئین ہیں سو وہ بے چارے اسے بہترا الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں مگر اپنے ڈھب کا نہیں پاتے! بہرحال! حسبِ سابق "العلم" چھپتا رہا اور .... ع

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

پر ہم بدستور عامل رہے۔

اس وقت ہمیں یہ بھی یاد آیا کہ جس قسم کے حالات سے ہم دو چار ہوئے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو بھی ان کا سامنا رہا۔ چنانچہ جب تک وہ "معارف" کے مدیر رہے قریب پچاس کروڑ آبادی کے برصغیر پاک و ہند اور پورے عالم اسلامی میں اس کی اشاعت ۴/۱ ہ سو سے زیادہ نہ تھی اور اس میں بھی اکثر پرچے اعزازی جایا کرتے تھے۔ اسی طرح بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم اپنے سہ ماہی رسالہ "اردو" کو تمام دوسرے علمی پرچوں کی مقررہ تعداد اشاعت کے مطابق ایک ہزار چھپوایا کرتے تھے اور تھوڑے سے پرچوں کی تقسیم کے بعد بقیہ کو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے انبار در انبار گودام میں محفوظ کرادیا کرتے تھے۔ ہمارا اکیسواں ۲۸ اٹھائیس صفحات کا سہ ماہی "العلم" بھی جس پر فی پرچہ دو روپے لاگت آتی ہے خیر سے ایک ہزار ہی چھپتا ہے اور معروز مستثنیات سے قطع نظر بڑی تعداد میں ۲۲ بائیس پیسے کے مزید ٹکٹ لگاکر اسے ملک اور بیرون ملک کے دانشکدوں اور دانشوروں کو روانہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس پر اچھی یا بری رائے تو بڑی بات ہے رسید تک نہیں آتی۔ اور نہ "مرسل الیہ" کا پتہ تبدیل ہو جائے تو اس کی کوئی اطلاع ملتی ہے۔ لہٰذا اب مجبوراً ہم نے یہ طے کیا ہے کہ اس مرتبہ پرانے لوگوں کو پرچہ ارسال کرنے کے بعد آئندہ ہم صرف ان حضرات کی خدمت میں رسالہ روانہ کریں گے جو کم از کم ہمیں اپنی خیر و عافیت اور موجودہ پتہ سے مطلع فرمائیں گے۔ ما بمہر شما بہ سلامت۔

(اکتوبر ۱۹۶۳ء)

"جمہوریت اور تعلیم"

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا کراچی میں قیام ۱۹۵۱ء میں ہوا اور ابتدا سے تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ تصنیف و تالیف کے کام پر بھی توجہ کی گئی۔ لیکن اس میدان میں بھرپور کام مرکزی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان کی مستقل گرانٹ کی بدولت ۱۹۵۶ء سے شروع ہو سکا۔ نہ صرف عام دلچسپی کی مفید سے مفید تر کتابیں طبع کی گئیں۔ بلکہ علمی۔ سائنسی اور فلسفیانہ موضوعات پر کلاسیکی اہمیت رکھنے والی کتابوں کو بھی پاکستان کی قومی زبان اردو میں منتقل کرنے کی سعی بلیغ کی گئی۔ ان کتابوں میں درج ذیل امہاتِ کتب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ جمہوریت اور تعلیم (ڈیماکریسی اینڈ ایجوکیشن) حصہ اول و دوم از جان ڈیوی۔

۲۔ اصول و اساس تعلیم (ایجوکیشن اِٹس ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلس) از سر پرسی نن۔

۳۔ جان ڈیوی کا فلسفۂ تعلیم (جان ڈیویز فلاسفی آف ایجوکیشن) از ڈاکٹر رونہ اسپنس آرنیٹ۔

۴۔ تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ (گراؤنڈ ورک آف ایجوکیشنل سائیکالوجی) از پروفیسر جے۔ ایس۔ راس۔

۵۔ چند عظیم علمائے جراثیم (مائکروب ہنٹرس) از ڈاکٹر پال۔ ڈی۔ کرا۔

۶۔ اصول تدریس (پرنسپلز آف ٹیچنگ) از رائبرن اینڈ فورج

۷۔ مقاصد تعلیم (ایمز آف ایجوکیشن) از اے۔ این۔ وائٹ ہیڈ

۸۔ پراسرار کائنات (مسٹیریس یونیورس) از سر جیمس جینس

۹۔ ثقافت وانتشار (کلچر اینڈ انارکی) از میتھو آرنلڈ

۱۰۔ عظیم علمائے نفسیات (گریٹ سائیکالوجسٹس) از ایس سارجنٹ

۱۱۔ مقدر انسانی (ھیومن ڈسٹنی) از لی۔ کامٹ۔ دو رائے۔

۱۲۔ ہند کے اسلامی عہد میں تعلیمی ترقی (پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول) از ڈاکٹر این۔ این۔ لا۔

۱۳۔ رفقائے عظیم (گریٹ کمپے نینس) از میکس ایسٹ مینن

۱۴۔ تعلیم کے ابتدائی اصول (فرسٹ پرنسپلس آف ایجوکیشن) از ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔

متذکرہ کتابوں میں سے اکثر بی ایڈ اور ایم ایڈ کے کورس میں شامل ہیں اور یا ان کا کتب حوالہ جات میں شمار ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں۔ خاص طور پر ٹیچرس ٹریننگ کالجوں میں ان کی حسب دلخواہ قدر دانی نہ ہو سکی۔ اس لئے نہیں کہ ان کا اصل انگریزی زبان ہی میں مطالعہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور اُردو ترجمہ معیاری یا مفید مطلب نہیں خیال کیا گیا بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اُن کو تعلیم و تعلم میں معروف حضرات سرے سے پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ جس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ یہ کتابیں مارکیٹ میں موجود نہیں ہیں۔ اور ہمیں ترجمہ کی غرض سے ان کو لیاقت

نیشنل لائبریری کراچی یا بعض دوسرے بیرونی بڑے کتب خانوں سے حاصل کرنا پڑا۔

زیرِ نظر کتاب "جمہوریت اور تعلیم حصّہ اوّل کو اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔ اور اب پورے دس سال بعد ہم اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ شاملِ نصاب اس انگریزی کتاب سے ہی ماہرینِ تعلیم کو دلچسپی نہیں ہے تو اس کے اُردو ترجمہ کا ایک ہزار کا ایڈیشن یعنی اوسطاً سالانہ سو کتابوں کا نکل جانا ہم اپنی اور غریب قومی زبان اُردو کی بہت بڑی کامیابی خیال کرتے ہیں۔

کتاب جمہوریت اور تعلیم (ڈیماکریسی اینڈ ایجوکیشن) ایک عہد آفریں کتاب ہے جس کے مصنّف علام کا نظریہ یہ ہے کہ:۔

"جدید صنعتی دنیا میں صحیح جمہوری تعلیم صرف وہ ہے جس میں علم کا حصول مفید پیشوں کی عملی مشق کے ذریعہ ہو۔ پُرانے طرز کے کتابی مطالعہ کے ذریعہ نہیں۔ ڈیوی نے کہا ہے کہ لبرل طریقۂ تعلیم عیش پسند طبقہ کے لئے موزوں ہوتا ہے جس میں مفید پیشوں سے نفرت کی جاتی ہے اور صرف انفرادی تہذیب و شائستگی پیدا کرنے پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ یونانی شرفاء کا طریقہ تھا۔ لیکن تعلیم کا یہ طریقہ ایک جمہوری برادری کے لئے موزوں نہیں ہے۔ جمہوری دور کی تعلیم عملی پیشوں میں مشغول رہ کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ سائنس کو بھی محض کتابی مطالعہ تک محدود

نہ ہونا چاہیئے بلکہ اسے مفید پیشوں کی عملی مشق کے ذریعہ سکھایا جانا چاہیئے"۔

ڈیوی کے اس نظریۂ تعلیم نے امریکہ کے نظام تعلیم میں ایک انقلاب برپا کردیا اور اسے جدید صنعتی تقاضوں کے مطابق بنادیا ہے۔ امریکہ ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں پر بھی اس کے نئے تعلیمی نظریات نے بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ حکومت ترکی نے اپنے قومی اسکولوں کی تنظیم نو کا کام ڈیوی کے سپرد کیا۔ اور اس نے اس سلسلہ میں ایک تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی۔ اسی طرح چین کی حکومت نے بھی اس کو تعلیمی تقریروں کے سلسلہ میں دعوت دی تھی اور وہ دو سال تک وہاں کے اساتذہ کو تعلیمی اصلاح کے اپنے نظریات کے سلسلہ میں خطبات دیتا رہا۔

حصولِ آزادی کے بعد سے ہمارا ملک پاکستان بھی نہ صرف ایک جمہوری ملک ہے بلکہ وہ صنعتی دور میں بھی داخل ہو چکا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ایک ایسے نظام تعلیم کو جو جمہوری اور عہد جدید کے صنعتی دونوں تقاضوں کو پورا کرے۔ ڈیوی کے عمیق مطالعہ سے ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے تحت ہم نے دس سال پہلے اس شاہکار کتاب کا اردو ترجمہ کرایا اور اب اس کا دوسرا اڈیشن شائع کر رہے ہیں۔

کتاب کا ترجمہ ہمارے نہایت عزیز اور فاضل دوست جناب سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ جنگ نے کیا تھا۔ جس کو ہم بڑی حد تک کامیاب اور عالمانہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنے دیباچہ میں تحریر فرمایا تھا کہ اس کے:۔

"بہت سے حصے زیادہ بہتر طور پر بھی بیان کئے جاسکتے ہیں جس کا سبب ایک تو خود ترجمہ کی اپنی ماہیت ہے کہ اس میں بہتری کی گنجائش تقریباً ہر وقت باقی رہتی ہے۔ دوسرے اس کتاب کی نوعیت ہے۔ ڈیوی ایک مشکل پسند مگر فکر خیز مصنف ہیں جو مختصر سی عبارت میں طویل تر مفاہیم ادا کرتے ہیں"۔

چنانچہ تقی صاحب نے مزید تحریر فرمایا کہ:۔

"سعی کے باوجود مترجم کو پورا احساس ہے کہ ترجمہ کو تاحال کئی جگہ بہتر بنانے کی پوری گنجائش باقی رہ گئی ہے"۔

لہٰذا خود لائق مترجم کے اس اعتراف کی بناء پر ترجمہ کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے، ہم نے طبع ثانی کے وقت پروفیسر یونس حسن فروغ علوی ایم۔ اے۔ بی ٹی (علیگ) سابق وائس پرنسل عثمانیہ کالج کراچی کو ڈھونڈ نکالا۔ موصوف جناب خواجہ غلام السیدین اور پرنسپل حبیب الرحمن مرحوم کے شاگردانِ رشید میں سے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کی غیر معمولی عمدہ صلاحیت کے مالک ہیں اور انھوں نے فلسفۂ تعلیم کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ پروفیسر فروغ علوی نے ہماری فرمائش پر کتاب پر نظرثانی کی اور خصوصیت سے تقی صاحب کی فلسفیانہ ادق زبان کو زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی ہے اور جس کام کے لئے، ہم جناب سید محمد تقی صاحب کو ان کی موجودہ شدید عدیم الفرصتی کے باعث تکلیف نہ دے سکتے تھے اس کو ہم نے پروفیسر فروغ علوی صاحب سے کرالیا ہے۔

جس کے لئے ادارہ کی جانب سے ہم ان کے بدل شکر گزار ہیں۔ توقع ہے کہ ہمارے دانشکدوں کے معزز اساتذہ اور طلباء نیز مرکزی وصوبائی محکمہ ہائے تعلیم کے ارباب دانش وبنیش اپنی قدر دانی سے سرفراز فرمائیں گے۔

(نومبر ۱۹۶۶ء)

غالب کی صد سالہ یادگار

اور

العلم کا غالب نمبر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو مرزا غالب کے انتقال کو سو سال گذر گئے اور بجا طور پر برّصغیر پاک و ہند کے اس عظیم ترین شاعر و مفکر کی صد سالہ یادگار دھوم دھام سے منائی گئی۔ نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک روس، انگلستان اور امریکہ وغیرہ میں بھی شاندار تقریبات ہوئیں۔

ہمارے یہاں یادگار مذکور منائے جانے کی تحریک اس طرح ہوئی کہ ۲ر مارچ ۱۹۶۸ء کو جناب قدرت اللہ شہاب صاحب (سابق سکریٹری مرکزی وزارت تعلیم) کراچی تشریف لائے اور انجمن ترقی اردو کے دفتر میں شہر کی سرکاری امداد یافتہ علمی و تحقیقی جماعتوں کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمائش کی کہ صد سالہ یادگارِ غالب کو خاص اہتمام کے ساتھ منایا

جائے۔ موصوف نے یہ بھی ایمار فرمایا کہ اس کام کے لئے خصوصی امداد دی جائیگی۔ جناب اختر حسین صاحب سابق گورنر مغربی پاکستان و صدر انجمن ترقی اُردو اس تحریک کے سرخیل قرار پائے، لیکن وقت گذرنے پر متوقع موعودہ امداد حاصل نہ ہوسکی۔ تاہم حضرت غالب سے بے لوث عقیدت اور جناب قدرت اللہ شہاب کے پاسِ فرمائش کی بنا پر سب لوگوں نے بطور خود ہی جو کچھ ہو سکا کر ڈالا۔ "بطور خود" کی گنجائش بھی نہایت محدود تھی کیونکہ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں ۵۹-۱۹۵۸ء سے علمی و تحقیقی اداروں کی گرانٹ میں نہ صرف تدریجی اضافہ ہوا بلکہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد سے اس میں بیس ۲۰ فیصدی کی کمی بھی واقع ہوگئی جو ایک "امرجنسی" ختم ہو جانے کے بعد پے در پے دوسری امرجنسیوں کے باعث اب تک قائم ہے[1]۔ مزید براں ہر چیز اور ہر کام کی ہولناک گرانی اور رفیق کار صاحبانِ علم و فضل کی بڑھتی ہوئی مالی مشکلات نے ذہن و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایسے میں تصنیفی و تخلیقی صلاحیت کا زوال پذیر ہونا بھی ناگزیر ہے۔ مالی و اقتصادی بدحالی حساس صاحبانِ قلم کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل !
کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل

خیر سے جس فخرِ روزگار ہستی' غالب کی ہم نے صد سالہ یادگار منائی اور جس کے اہتمام و انصرام میں لکھو کھا روپیہ صرف ہوا وہ بھی زندگی بھر

---

[1] ۷۲-۱۹۷۱ء میں پانچ فی صد کی گرانٹ میں اور کمی ہو گئی۔ (بریلوی)

مالی مشکلات کا شکار اور "قرض و فاقہ مستی" کی مصیبت میں گرفتار رہا۔ آج آپ غالب کے "قتل" ہو جانے کے بعد جس قدر چاہیں "جفا سے توبہ" کریں۔ اس کے مقبرہ کو زیادہ سے زیادہ بلند و بالا بنائیں۔ مگر اس نقصانِ عظیم کی تلافی نہ کر سکیں گے جو اس کو بقدر ضرورت پیسہ نہ دے کر پہونچا چکے ہیں۔

تاراجِ کاوشِ "غمِ دوراں" ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

خیال کیجئے کہ اگر غالب کو مالی فراغت بھی حاصل ہوتی تو وہ اور کیا کچھ نہ کرتے۔ افسوس ہے کہ ان کی دماغی و ذہنی توانائیوں کا بڑا حصہ چھوٹی چھوٹی رقوم کے حصول میں صرف ہو گیا۔

اپنے نہایت محترم دوست جناب مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مرتب کردہ مکاتیب غالب کو جب میں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑا ہی رنج ہوتا ہے۔ خود بین و خود نما والیانِ ریاست رامپور نے ٹکے ٹکے عطیات کے لئے غالب جیسے عالی ظرف اور خود دار انسان سے کیسی کیسی گھٹیا خوشامد کرائی اور پھر مرغ بسمل کا دنیا کو تماشہ دکھانے کے لئے اس کی عرضداشتوں کو نہ صرف حفاظت سے رکھا گیا بلکہ اس باعثِ ننگ و عار مجموعۂ عرائض کو خاص اہتمام سے طبع بھی کرایا گیا۔

غالب ہی پر کیا موقوف ہے، برصغیر پاک و ہند کے محسنِ اعظم سرسید

کا انتقال ہوا تو ان کے ذاتی سامان میں دو مکمل جوڑے کپڑوں کے نہ تھے۔ مولانا حالی حیدر آباد کی سو روپے کی قلیل پنشن پر انتہائی تنگی ترشی سے گزر اوقات کرتے رہے۔ ایسی تنگ دستی کہ اگر اچانک کوئی مہمان آ جاتا تو وہ اپنا کھانا اس کو کھلا دیتے اور خود فاقہ سے سو جاتے۔ حکیم الامت علامہ اقبال بھی مدت العمر فکرِ معاش سے نجات نہ پا سکے اور اگر آخری زمانہ حیات میں سر سید راس مسعود مرحوم کی سعی سے پانچسو روپے ماہوار کا بھوپال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ ہو جاتا تو خدا معلوم کون سے رفاہی اسپتال میں ان کا انجام بخیر ہوتا۔

جب سے راقم آثم نے ہوش کی آنکھیں کھولیں برصغیر پاک ہند کے صدہا شکسپیر، ملٹن۔ اور رازی و غزالی کو بیکسی کی موت مرتے ہوئے دیکھا۔ البتہ جب وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تو ہر کسی کو یہ انکشاف ہوا کہ اوہو! یہ تو بہت بڑا آدمی تھا۔ بے وقت مر گیا۔ خیر کوئی بات نہیں! اب ہم اس کے کام کو اجاگر کریں گے۔ اس کے نام کو زندہ جاوید بنائیں گے۔ اس کی تخلیقات کو چھاپیں گے۔ اس کی سوانح عمری لکھیں گے۔ اور اس کے بے سہارا متعلقین کی مالی امداد کریں گے۔ ان نیک ارادوں کے اعلان میں فی زمانہ ہمارے عزیز و محترم دوست جناب جمیل الدین عالی پیش پیش رہے ہیں۔ اگرچہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کے مستحسن اقدامات کا نتیجہ کیا نکلا۔ چونکہ مذکورہ نتیجہ سے بے خبری ہے اس لئے کم از کم میں نے تو اپنی

اولاد کو وصیت کر دی ہے اور ان سطور کے ذریعہ اس وصیت کا اعلانِ عام بھی کرتا ہوں کہ میرے بعد میرے پسماندگان کی امداد کے واسطے ہرگز ہرگز کوئی اپیل نہ کی جائے۔

آپ فرمائیں گے کہ ہمارے ملک کے سرمایہ دار ساری دُنیا کے صاحبِ ثروت لوگوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ مخیّر واقع ہوئے ہیں۔ ذرا آزما کر تو دیکھا ہوتا۔ سو عرض ہے کہ کسی ذاتی معاملہ میں نہیں بلکہ صفائی سلسلہ میں ہمارے ملک کے مشہور صنعت کار جناب خان بہادر حاجی حبیب اللہ صاحب کو جب میں کراچی میونسپل کارپوریشن کا ممبر تھا مجھ سے بہت محبت تھی۔ ایک دفعہ انھوں نے بھری محفل میں وعدہ کیا کہ وہ احاطہ سرسید گرلس کالج کو عمارتوں سے بھر دیں گے، یا اسی طرح ایک بار جناب سیّد ابو نصر صاحب سابق کمشنر حیدرآباد ڈویژن کی مہربانی سے عالی جناب سیٹھ فخر الدین ولی بھائی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا اور مَیں نے ان سے سرسیّد گرلس کالج کی امداد کے لیے گذارش کی تو موصوف نے فرمایا کہ سندھ انڈسٹریل ایریا آتے جاتے میں روزانہ کالج کے پاس سے گذرتا ہوں تو اُسے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور دل سے تمہاری تعریف کرتا ہوں۔ ذرا اطمینان ہو جائے تو ایک اچھا

ڈونیشن دوں گا۔ ان دونوں معزز حضرات کی خیرسگالی اور دعاگوئی میں تیرہ برس گذر گئیں۔ دیکھئے کب درِ اجابت وا ہوتا ہے اور کب اُمیدِ کرم پوری ہوتی ہے۔ بہرحال! (جملۂ معترضہ معاف!) جوں جوں اس جہانِ رنگ و بو سے دائمی جدائی کا وقت قریب آتا نظر آرہا ہے ایک فکر البتہ رہتی ہے کہ مجھ پر جو قرض ہے وہ میری زندگی ہی میں ادا ہو جائے۔ ویسے میرے محسن و مخدوم حضرت علامی ممتاز حسن صاحب (ستارۂ پاکستان) کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے کہ "مجھے مقروض رہنا ہی چاہیئے"! غالباً اس مخلصانہ اور حکیمانہ قول میں یہ راز پنہاں ہے کہ جب تک ایک قلم کار ؎

شب چو عقدِ نماز بر بندم
چہ خورد بامداد فرزندم

کی چکی میں خوب نہیں اور باریک نہیں پستا صاحبانِ ہوش و بصیرت کی لذتِ کام دہن کا سامان مہیا نہیں ہو سکتا ؏

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

۱۹۶۸ء

اب "العلم" کے اس "غالب نمبر" کی بھی کچھ بات ہو جائے۔ اکتوبر تا دسمبر کے پرچہ میں ہم نے اس کا اعلان کیا تھا اور ناظرین باتمکین سے استدعا کی تھی کہ اس کی پانچ روپے قیمت پیشگی ارسال فرمادیں تاکہ اس کی اشاعت میں آسانی ہو جائے۔ صرف بہاولنگر کے مولوی فضل محمد خاں صاحب نے اپنا چندہ بھیجا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلّا۔ دوسری طرف رسالہ کی ضخامت زمانۂ قبلِ

"تہذیب" کی زلفِ محبوب کی طرح بڑھتی ہی چلی گئی۔ اور بقول غالب ؎

نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

ختم اپریل ۱۹۶۹ء تک مضامین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور ہم انھیں برابر سر آنکھوں سے لگا کر ان کی کتابت و طباعت میں بے دریغ روپیہ صرف کرتے رہے۔ تا آنکہ جیب و دامن کی تنگی نے بالآخر بے بس کر دیا اور رسالہ کو سوا چھ سو صفحات پر مجبوراً ختم کرنا پڑا۔ اندازہ سے بہت زیادہ ضخامت بڑھ جانے کے باعث رسالہ کی قیمت بھی پانچ کی بجائے (علاوہ محصولِ ڈاک) دس روپے مقرر کرنا ناگزیر ہو گیا۔ اگرچہ پانچ یا دس روپے قیمت رکھنا ہے قطعاً بے سود۔ رسالہ کو چھاپ کر بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب مرحوم کی طرح ہم گودام میں بند کر دینے سے رہے۔ تھوڑے سے روک کر باقی تمام پرچے حسب معمول شائقین و ناظرین کرام کی خدمت فیض درجت میں (جن کی غالب اکثریت بفضلہٗ صاحبِ استطاعت ہے) ہم مفت روانہ کر دیں گے۔ اور یقین واثق ہے کہ (مستثنیات سے قطع نظر) اس کی قیمت وصول نہ ہوگی۔ رسید شکریہ اور تعریف و توصیف کے خطوط البتہ کافی تعداد میں آئیں گے۔ جو سے نہ صرف محرومیٔ تمنّا کا سارا گلہ دور ہو جائے گا بلکہ شاید ہم یہ بھی کہہ سکیں گے کہ ؎

آنکھوں کو ہے ہوس کہ رخِ سادہ دیکھئے
سر میں ہوائے طرّۂ پُر پیچ و خم نہیں
(شیفتہ)

بہرحال! مندرجہ بالا تاثرات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اب یہ سُنیے کہ آپ کی دُعا رسے "العلم" کا زیرِ نظر "غالب نمبر" خاصے کی چیز بن گیا ہے، جس کا پورا کریڈٹ عزیزی پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کو پہنچتا ہے، جنہوں نے حصولِ مضامین کے لئے بے پناہ جدوجہد کی۔ موصولہ مضامین کی ترتیب و تسوید میں کاوش کی اور بعد کتابت کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح و طباعت تک کے صبر آزما کام کی خود ہی نگرانی کی۔ اگر وہ اس اہم کام میں میرے معینِ کار نہ ہوتے تو یہ پُربہار گلدستۂ غالب ہرگز سج سجا کر منصۂ شہود پر نہ آتا۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور ادارۂ "العلم" کی جانب سے قادری صاحب کا بدلِ سپاس گزار ہوں۔ عزیز موصوف ایک ہونہار صاحبِ قلم ہیں۔ خداداد ذہانت اور محنت شاقہ کی بدولت علمی دُنیا میں ان کا اعتبار و اعتماد تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے بکثرت تصنیفی ادارے اور اہلِ علم ان سے محبت کرتے ہیں اور اچھے اچھے کاموں میں ان کے تعاون کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اس شمارہ کے لکھنے والے بھی خدا نظرِ بد سے بچائے مسلّمہ شہرت کے مالک اور بہت بڑے بڑے صاحبانِ علم و فن ہیں۔ ان کی "العلم" نوازی میرے لئے حیرت انگیز بھی ہے اور باعثِ شکر گزاری بھی۔ میرا اور ادارے کے پاس سیم و زر نہیں جو ان پر نچھاور کیا جائے۔ دین دُنیا کی سلامتی و خوشحالی کے لئے دُعائے خیر میں البتہ کوتاہی نہ ہوگی۔ ؏

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

(جون ۱۹۶۹ء)

"علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں"

انگریز برِصغیر پاک و ہند میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے بمبئی اور مدراس پریسیڈنسیوں کے حصول کے بعد بنگال و بہار پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۸۰۱ء میں انھیں نوابانِ اودھ کی کمزوری اور ناعاقبت اندیشی سے دوآبہ روہیلکھنڈ کے زرخیز علاقے بغیر لڑے بھڑے مل گئے۔ ۱۸۰۳ء میں وہ "دہلی" پر مسلط ہو گئے۔ پھر پچاس سال کے عرصہ میں پنجاب، سرحد اور سندھ پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح نہ صرف پورے شمالی ہند پر برطانوی پرچم لہرانے لگا بلکہ ملک کا گوشہ گوشہ (بشمول برما) ان کی مضبوط گرفت میں آ گیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے انگریزوں کے غلبے کے بعد دارالحرب کا فتویٰ دیا اور مسلم اقتدار کی بحالی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی۔ سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید کی قیادت میں یہ تحریک آگے بڑھی اور اس نے ملک گیر حیثیت حاصل کر لی۔ اس

تحریک نے معاشرتی و اقتصادی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی۔ اور تحریک جہاد ملک کی مقبول و فعال تحریک بن گئی۔ جب پنجاب و سرحد میں اس تحریک کا انگریزوں سے براہ راست ٹکراؤ ہوا تو انھوں نے اپنی چالبازیوں سے اس تحریک کو مسلمانوں میں نامقبول و ناکام بنانے کی پوری پوری کوشش کی۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ انھوں نے اس تحریک کو "وہابی تحریک" کا نام دیا۔ "وہابی" اور "باغی" مترادف الفاظ قرار پائے۔

انگریزوں نے مسلمانوں کے انداز فکر کو بدلنے کے لئے ملک میں مغربی افکار و خیالات اور انگریزی زبان و ادب کی ترویج ضروری و لازمی سمجھی اور اس سلسلے میں سرکاری و غیر سرکاری سطح پر کوششیں عمل میں آئیں۔ انگریزوں نے سب سے پہلے اس کا تجربہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دہلی کالج کے ذریعے کیا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن جابرانہ نظام حکومت اور لوٹ کھسوٹ کے باعث انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بڑھتا رہا تا آنکہ یہ "لاوا" جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی صورت میں پورے ملک میں پھوٹ پڑا۔ مگر بدقسمتی سے اس جنگ کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا اور پورے برصغیر پاک و ہند پر "تاج برطانیہ" کا از سرنو استیلاء و غلبہ ہو گیا چونکہ اس جنگ میں قیادت و امامت من حیث المجموع مسلمانوں نے انجام دی تھی لہٰذا اس کا خمیازہ بھی ان ہی کو بھگتنا پڑا۔ پھانسی

کے تختوں پر لٹکائے گئے۔ توپ دم کیے گئے۔ قید و بند کے شدائد جھیلے، حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزائیں بھگتیں، ترکِ وطن پر مجبور کیے گئے، املاک و جائداد ضبط و نیلام ہوئیں اور وہ اپنے ملک میں سیاسی یتیم بلکہ لاوارث ہو کر رہ گئے۔ سرسید احمد خاں کس دلسوزی سے لکھتے ہیں۔

"یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہے جو ۱۸۵۷-۵۸ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گذرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانہ میں ہوتی ہو، گو وہ رام دین ماتا دین ہی نے کی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جو اس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔

ہر بلائے کز آسمان آید — گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمین نارسیدہ می پرسد — خانۂ "مسلمے" کجا باشد

ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے حریف ہندو من حیث القوم انگریزوں کے معتمد قرار پائے۔ انھوں نے انگریزی اقتدار کے آغاز کے ساتھ ہی انگریزی زبان اور مغربی علوم و فنون سے بھی اعتنا کیا تھا لہذا سرکار و دربار میں ان کی رسائی ہونے لگی۔ عہدوں اور ملازمتوں پر فائض ہو گئے۔ اور ان کے سیاسی اثر و اقتدار کی راہ بھی ہموار ہو گئی۔

مسلمانوں کی سیاسی بدحالی کے ساتھ ان کی معاشرتی و اقتصادی حالت بھی نہایت زبوں اور خراب ہوئی۔ جاگیرداریاں اور زمینداریاں ختم ہوچکی تھیں۔ ملازمتوں کا دروازہ بند ہوگیا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اس دردانگیز صورت حال کے ازالہ کا من جانب اللہ سامان ہوا۔ اور بمصداق "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

سرسید احمد خاں جیسے "عبقری زمانہ" اور نابغۂ روزگار میدان عمل میں آئے۔ انھوں نے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لیا۔ ماضی کو دیکھا، حال کو نظر میں رکھا اور مستقبل کا اندازہ لگایا۔ سرسید احمد خاں نے غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ اب انگریزوں کی پائدار اور مستقل حکومت قائم ہوچکی ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے مل کر رہنا چاہیے اور امن و امان کی زندگی گذارنی چاہیئے۔ نفرت و عدم اعتماد کی فضا اور باغی در ہایا کی غلط فہمی دُور کرنی چاہیے اور کچھ دنوں کے لئے مسلمانوں کو سیاست سے کُلیتہً کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ مسلمانوں سے انگریزوں کی بدظنی دور ہو جائے۔ مسلمانوں کو مغربی علوم اور انگریزی زبان و ادب کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اور اس زبان میں مہارت تامہ اور قابلیت کاملہ حاصل کرکے اپنے مرتبے کو بحال کرنا چاہیئے۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی نجات و فلاح اور شیرازہ

بندی کی وہ تدابیر سوچیں اور اختیار کیں جن سے قوم کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑ آیا۔ اور ایک روشن مستقبل کی جھلک نظر آنے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑا آدمی جو دنیا میں تاریخ کا رُخ پھیرنے یا قوموں کی زندگی بنانے آتا ہے وہ ایک مرتب و منظم ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے کام اور اس کی تدابیر بخت و اتفاق پر مبنی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق کام کرتا ہے چنانچہ یہ بات ہمیں سرسید احمد خاں کے کاموں میں پورے طور سے نظر آتی ہے۔

سرسید نے بڑے استقلال سے انگریزوں کی بدظنی کو دور کیا اور مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون اور انگریزی زبان و ادب کی کی ترویج و اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ اپنے خیالات کو پوری ہم آہنگی سے نشر کیا اور دوسروں کے افکار کا ہمدردی سے تجزیہ کیا۔ عصری ضرورتوں اور تعلیم و تربیت کے طریق و انداز کے عینی مشاہدہ کے لئے وہ انگلستان گئے۔ وہاں کے نظام تعلیم، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا دیکھا اور ایک عملی اسکیم بنا کر لائے جس کے تحت ۱۸۷۲ء میں علی گڑھ میں انھوں نے ایم اے او اسکول اور پھر کالج قائم کر دیا نیز مسلمانوں کے ذہن نشین کیا کہ انھیں تعلیم جدید کے حصول میں کما حقہ کوشش کرنی چاہیئے تاکہ وہ برادرانِ وطن اور حکمرانوں کی نظر میں کوئی مقام حاصل کرسکیں انھوں نے اپنے مقصد کی نشر و اشاعت کے لئے دو اخبار "تہذیب الاخلاق"

اور "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" جاری کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اخبارات نے خوب کام کیا۔ ان اخباروں کے مقاصد کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ فرد اور قوم کے اخلاق کی اصلاح، تہذیب و شائستگی اور قومی عزت کا احساس پیدا کرنا، قوم کو جدید ترقیات علمی کی طرف راغب کرنا، علمی نقطۂ نظر کی اصلاح، دینی زاویۂ نگاہ کی اصلاح، ادب و انشاء کے لئے ذوق صحیح کا پیدا ہونا۔ اردو کو قومی حیات اور اجتماعی افکار کا ترجمان بنانا۔ ان اہم مقاصد کے حصول کے لئے پہلی شرط قوم کو جدید تعلیم سے روشناس کرنا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے اس امر کی بھی انتہائی کوشش کی کہ قوم اپنے قدیم علوم اور اپنی تہذیبی روایات سے بیگانہ نہ ہو جائے۔

ان ہر دو مقاصد کے حصول کے لئے ایک ملک گیر تحریک چلائی جو "علی گڑھ تحریک" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں ملی احساس، قومی شعور اور اجتماعی فکر کا رجحان پیدا کیا۔ عصری ضروریات مغربی علوم و فنون کی اہمیت اور تعلیم جدید کی ضرورت کو سمجھایا۔ مذہب میں وسیع النظری، ادب میں سلاست و صفائی اور مقصدیت اور سیاست میں زمانی و مکانی تقاضوں کا لحاظ رکھا۔ غرض کہ مذہب، سیاست، ادب، معاشرت ہر شعبۂ حیات میں "علی گڑھ تحریک" اثر انداز ہوئی اور اس کے دائرۂ فکر نے ہمہ گیری اور جامعیت اختیار کر لی مولانا صلاح الدین مرحوم

ایڈیٹر "ادبی دنیا" لکھتے ہیں:-

"درحقیقت سید کے روپ میں قوم کو ایک جن مل گیا تھا جو اس کے لیے چشم زدن میں ہر وہ کام کر دیتا تھا جو برسوں میں ثروت و حکومت کے سہارے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہیں غیروں کے حملے کی روک تھام کی جا رہی ہے کہیں اپنوں کے دماغ کے اوہام کے جالے صاف کیے جا رہے ہیں۔ کہیں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں معماروں اور باغبانوں کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ کہیں نئے تصورات کی تحصیل اور اپنے اعتقادات کے تحفظ کے لیے سات سمندروں کے سفر کیے جا رہے ہیں کہیں ملک کی مجالس قانون ساز میں قومی مفاد کے لیے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے خطبات احمدیہ، تہذیب الاخلاق اور تفسیر القرآن کے ذریعہ اذہان کی روشنی اور اخلاق کی بلندی کا سامان بھی فراہم ہو رہا ہے۔ غرض کہ ترقی و رفعت کا ایک معرکۂ عظیم ہے جس کے مختلف محاذوں پر بیک وقت یورش بھی کی جا رہی ہے اور دفاع بھی اور بڈھا سپہ سالار ایک ہاتھ میں دوربین اور دوسرے میں شمشیرِ عمل لیے ہر مورچے پر مثل برق پہنچتا اور مثال ابر گرجتا ہے۔"

سرسید احمد خاں چاہتے تھے کہ مسلمان تعلیمی و اقتصادی میدان میں آگے بڑھیں اور ملک میں ایک آبرومندانہ مقام حاصل

کرلیں اور کچھ دنوں کے لئے سیاست سے دست کش ہو جائیں۔ بالخصوص ہندوؤں کے ساتھ مل کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے اُن کی ملی انفرادیت ختم ہو جائے۔

۲۵ دسمبر ۱۸۸۵ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ سرسید احمد خاں نے دیانتداری سے یہ سمجھا کہ یہ جماعت اور تحریک مسلمانوں کے مخصوص حالات کی بنا پر اُن کے لئے مفید نہیں ہے۔ اور بعد کے واقعات نے ان کے اُس اندیشہ کو صحیح ثابت کر دیا۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ پلیٹ فارم آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے قائم کیا۔ جس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا اور اس کے دس مندرجہ ذیل مقاصد قرار پائے۔

۱۔ مسلمانوں میں یورپین سائنس و لٹریچر کی اشاعت اور اعلیٰ تعلیم کی کوشش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کے قدیم علوم کے متعلق تحقیقات کرنا اور اردو اور انگریزی میں رسالے لکھوانا۔

۳۔ مشہور علماء اور مصنفین اسلام کے سوانح حیات اردو اور انگریزی میں مرتب کرنا۔

۴۔ مسلم مصنفین کی قدیم تصانیف کی فراہمی۔

۵۔ زمانہ قدیم کے تاریخی واقعات۔

۶۔ بنیادی علوم کے مسائل کی تحقیق و اشاعت۔

۷۔ شاہی فرامین کو جمع کر کے ایک کتاب انشاء مرتب کرنا۔

۸۔ مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کی درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا۔

۹۔ علوم مشرقی اور دینیات کے علماء سے ربط قائم کرنا اور ان کی تعلیم میں ترقی کی کوشش۔

۱۰۔ قدیم مکاتب کی اصلاح و ترقی۔

ان مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سید صاحب نے فرمایا۔

"اس وقت تک ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ایک قوم مسلمان کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ناواقف ہیں کہ ہم نہیں جانتے ہیں کہ پنجاب کے لوگوں کا قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت کیا خیال ہے اور انھوں نے کیا کیا ہے اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ پنجاب ایک دوسرا صوبہ ہے۔ ہم اپنے ہی صوبہ (یو۔پی) کے ایک ضلع کے رہنے والے دوسرے ضلع کے رہنے والوں کے حال سے محض ناواقف ہیں کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، ایک کے حال سے دوسرے کو آگاہی ہو، ہم آپس میں مل کر اپنے خیالات جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں دوسروں پر ظاہر کر سکیں، ایک

دوسرے کے خیالات سے تبادلہ ہو۔ ہم باوجود ایک قوم مسلمان ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں ان میں قومی یگانگت بلکہ مجھ کو کہنا چاہیئے کہ قومیت پیدا ہو۔ ان ہی خیالات سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی پر غور کرنے کے لئے مختلف مقامات و مختلف صوبہ جات کے لوگ ایک جگہ جمع ہوا کریں اور ایک صوبے اور ایک ضلع کے لوگوں کے ذریعے سے دوسرے صوبے اور ضلع کے مسلمانوں کو حالات معلوم ہوتے رہیں اور جو تدابیر ان کی بھلائی اور ترقی کی نسبت سوچی جائیں ان پر بحث و مباحثہ ہو کر جو تدبیر عمدہ قرار پائے وہ اختیار کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ کانفرنس نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں قومی یکجہتی و ہم آہنگی کا وہ صور پھونکا کہ تمام ملک خواب غفلت سے بیدار ہو گیا اور از بنگال تا سرحد اور از پنجاب تا مدارس و دکن مسلمانوں کو اپنی قومی و اجتماعی تعلیم و ترقی کا احساس ہو گیا۔ اور اسی بیداری کے نتیجے میں آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

کانفرنس نے علاقائی، صوبائی اور طبقاتی حد بندیوں کو نظر انداز کر کے ملک گیر قومی احساس پیدا کیا۔ اور اس پلیٹ فارم سے جو

مطالبہ کیا جاتا تھا وہ قوم کی متفقہ آواز ہوتی تھی۔ اس کانفرنس نے پورے ملک میں اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرکے اجتماعی شعور اور قومی احساس پیدا کیا۔ ملک کے منتخب مشاہیر، اہل الرائے، قائدین اور ارباب علم و فضل نے کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے اجلاس یو۔پی۔ دہلی، پنجاب، بنگال، سندھ، بمبئی، سی پی، مدراس، بہار، بنگال، دہلی، اجمیر تمام صوبوں میں منعقد ہوئے بلکہ رامپور اور خیر پور (سندھ) کی ریاستوں نے بھی پذیرائی کی، حد یہ کہ اس کی سرگرمیوں کا دائرہ عمل رنگون تک پہنچ گیا۔ ملک کے ہر علاقے اور طبقے کے مشاہیر نے کانفرنس کے اجلاسوں کی صدارت کی۔ یو۔پی اور دہلی سے۔ مولوی سمیع اللہ خاں، نواب محمد اسحاق خاں۔ منشی امتیاز علی کاکوروی، نواب محسن الملک، مولوی محمد حشمت اللہ بریلوی۔ سر علی محمد خاں راجہ محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر شاہ سلیمان، سر راس مسعود، سر سید رضا علی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، نوابزادہ لیاقت علی خاں، صوبہ پنجاب سے سردار محمد حیات خاں، جسٹس محمد شاہ دین، نواب فتح علی خاں قزلباش، مشیر الدولہ خلیفہ محمد حسین، خان بہادر مولوی رحیم بخش (بہاولپور) سر محمد شفیع، سر فضل حسین، سر عبد القادر کرنل مقبول حسین، صوبہ بنگال سے جسٹس سید امیر علی، جسٹس شرف الدین، نواب خواجہ سر سلیم اللہ

سر عبدالرحیم مولوی اے کے فضل الحق۔ سر عزیز الحق۔ صوبہ بمبئی سے سر آغا خاں (سوم) جسٹس بدرالدین طیب جی، علامہ عبداللہ یوسف علی، سر ابراہیم رحمت اللہ، سر ابراہیم ہارون جعفر، صوبہ مدراس سے نواب سی عبدالحکیم۔ صوبہ سرحد سے۔ صاحبزادہ سر عبدالقیوم حیدر آباد دکن سے نواب عماد الملک، سر اکبر حیدری، نواب کمال یار جنگ اور نواب ظہیر یار جنگ جیسے اکابر و مشاہیر نے کانفرنس کی صدارت کی۔ اور خطاب کیا۔ ان تمام اکابر کے پیش نظر ملک گیر متحدہ قومیت کا تصور تھا۔ اور اسی کی انہوں نے تبلیغ و اشاعت کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال کے اجلاس میں پنجاب اور سندھ سے متعلق تجاویز پاس ہوئی تھیں۔ اور پنجاب کے اجلاس میں یو۔ پی اور مدراس کے معاملات زیر بحث آتے تھے۔ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کشمیر، الور، میوات، جے پور، جودھ پور اور ریاست ٹونک کے تعلیمی مسائل پر نہ صرف مفید تجاویز پاس ہوئیں بلکہ ان کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا۔

علی گڑھ تحریک اور ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں کے نتیجے میں بکثرت شہروں میں اسلامیہ ہائی اسکول قائم ہوئے۔ اسلامیہ کالج پشاور، سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی، محمڈن عربک اسکول پٹنہ، اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ، بدایوں، بریلی اور میرٹھ وغیرہ اسی

تحریک کے نتیجہ میں قائم ہوئے۔ بعد ازاں اس کے برکات علی گڑھ یونیورسٹی ڈھاکہ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں نمودار ہوئے۔ تحریک ندوۃ العلماء، انجمن حیات الاسلام لاہور مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) جیسے مذہبی اداروں پر اس تحریک کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں کانفرنس کے ایک شعبہ کی حیثیت سے قائم ہوئی اور ۱۹۱۲ء میں بابائے اردو مولوی عبد الحق کی قیادت میں اُس نے ایک مستقل ادارہ کی حیثیت اختیار کی۔ انجمن ترقی اردو کی علمی اور ادبی خدمات اظہر من الشمس ہیں اسی طرح کانفرنس کے ایک اجلاس منعقدہ ڈھاکہ ۱۹۰۶ء میں نواب وقار الملک کی تحریک پر مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس کی کوششوں سے بالآخر ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آیا۔ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے حفظ قرآن، اوقاف کی آمدنی سے تعلیم، اصلاح رسوم، فضول خرچی اور رسوم بیجا سے احتراز تعلیم دینیات، فارسی تعلیم جاری رکھنے کی کوشش، عربی تعلیم کی ترویج اور وظائف کی فراہمی، ندوۃ العلماء کی تائید، مکاتب قرآن کا اجراء قانون، انجینئرنگ، ڈاکٹری اور ٹیکنیکل تعلیم پر زور، سرکاری سکولوں میں مذہبی تعلیم، طب یونانی کی ترقی، قیدیوں کی تعلیم اور تعلیم اطفال تعلیم بالغان، تعلیم نسواں، وغیرہ غرض اس نوع کے تمام امور پر مختلف اوقات میں مفید اور کارآمد تجاویز پاس ہوئیں جن کے

خاطر خواہ مفید نتائج بھی بر آمد ہوئے۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اُردو کے تحفظ و بقا کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ سرسید اپنی زندگی کے آخری ایام تک جد و جہد کرتے رہے۔ ان کے جانشین نواب محسن الملک نے تو گورنر یو۔ پی تک سے "ٹکر" لی۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں حسرت شروانی بھی مدت العمر اردو کی توسیع و اشاعت کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ان اکابر کی کم و بیش ایک صدی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہ آج بدلتے ہوئے حالات میں ہر طرف سے شدید مخالفت کے باوجود نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے گوشہ گوشہ میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اُردو کی مضبوط جڑیں ہلائے نہیں ہلتیں، اُردو کو بین الصوبائی افہام و تفہیم کی قومی زبان بنانے کے لئے ہر طبقہ و خیال کے بزرگ ہم رائے تھے۔ چنانچہ جسٹس سید امیر علی کلکتہ کے اجلاس منعقدہ ۱۸۹۹ء میں فرماتے ہیں۔

"یہ امر جس کو میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اُردو زبان بنگال اور بمبئی کے اسکولوں میں بطور اختیاری زبان کے رہنی چاہیے مگر یہ معاملہ زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔"

اسی طرح آگرہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۳ء میں جسٹس محمد شاہ دین

نے فرمایا۔

"اردو جس کو عام طور سے ہندوستانی کہتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کی بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصے کی زبان ہے اور اس کو ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل ہے، فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ہے۔"

علی گڑھ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۶ء میں سر محمد شفیع نے فرمایا۔

اُردو جو درحقیقت ہندوستان کی عام زبان ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اتحاد سے صدیاں گزریں پیدا ہوئی تھی۔ ہر وہ کوشش جو اردو زبان کے خلاف ہوگی وہ نااتفاقی پر منتج ہوگی۔ اور ہندو اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے لئے بربادکن ثابت ہوگی۔"

کلکتہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری نے فرمایا۔

"اردو کی اشاعت اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں ایک خاص مناسبت ہے جن جن مقامات پر اُردو زیادہ رائج اور شائع ہے اسی قدر وہاں کے مسلمان زیادہ سرگرم اور مستعد معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح جس نسبت سے اردو مختلف مقامات میں داخل ہوتی جاتی ہے۔ اسی نسبت سے وہاں کے مسلمانوں کا جمود ٹوٹتا جاتا اور ان میں وسعتِ نظر اور احساسِ قومی پیدا ہوتا جاتا ہے۔"

امرتسر کا اجلاس منعقدہ ۱۹۰۸ء میں نواب خواجہ سر سلیم اللہ (ڈھاکہ) کی زیر صدارت منعقد ہوا اور اس میں سر شیخ عبدالقادر (مخزن) نے پنجاب سے متعلق اردو کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل تجویز پیش کی۔

"اس کانفرنس کی رائے میں اردو صوبہ پنجاب میں تعلیمی اغراض کے لئے بالعموم اور ابتدائی تعلیم کے لئے بالخصوص نہایت مناسب اور موزوں زبان ہے۔ اور بحیثیت زبان درسی جو مرتبہ اس کو مدارس میں حاصل ہے اسے قائم رکھنا ترقی کے لئے ضروری ہے۔"

اسی اجلاس میں سر محمد شفیع نے دوسری تجویز پیش کی۔

"یہ کانفرنس ڈاکٹر پی۔ سی چٹرجی سی۔ آئی۔ ای کی اس تجویز سے جو انہوں نے حال میں پنجاب یونیورسٹی کے جلسۂ کانووکیشن میں پیش کی ہے کہ زبان پنجابی کا کورس صوبے میں بجائے اردو کے رواج دیا جائے۔ اختلاف کرتی ہے، اور اس تجویز کو بہ لحاظ قلت لغات پنجابی و اختلاف محاورہ ناممکن العمل اور اس صوبے کے حق میں سخت مضر سمجھتی ہے۔"

کلکتہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۷ء میں جو سر اکبر حیدری کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ مولوی اسمٰعیل حاجی برہانی کی تحریک اور فضل رحیم کی تائید سے مندرجہ ذیل تجویز پاس ہوئی۔

"یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ جن طلبہ کی مادری زبان اُردو نہیں ہے ان کے لئے بطور سیکنڈ لینگویج کے صوبہ بنگال، بمبئی میں اردو کو سیکنڈ لینگویج کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ نیز اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ایسے طلبہ کے لئے زبان اُردو میں کتب درسیہ ایسی موجود ہیں جو بلحاظ وقعت زبان وباعتبار تہذیب آموزی کے زبان فارسی اور عربی کی رائج الوقت کتب درسیہ کے ہم پلہ ہیں۔"

چنانچہ اس کوشش کے نتیجہ میں صوبہ بمبئی میں اردو سیکنڈ لینگویج کی فہرست میں شامل ہو گئی۔ کانفرنس کے اجلاس کراچی ۱۹۰۷ء راولپنڈی ۱۹۱۴ء خیر پور ۱۹۱۹ء اور لاہور ۱۹۳۲ء کی بدولت سندھ، بلوچستان اور سرحد میں بھی اُردو کا کام زور شور سے ہوا۔ بکثرت اُردو مدارس قائم ہوئے اخبارات ورسائل جاری ہوئے اور ہر دور میں یہاں کے شعراء اور مصنفین نے اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اس قدر کام کیا کہ آج دلی، یو۔پی، بہار اور ریاست حیدر آباد (دکن) سے آئے ہوئے مہاجرین اپنے وطن ثانی میں بہت کم لسانی اور ثقافتی اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح بنگال میں سلہٹ سے چاٹگانگ تک ہر جگہ بنگالی کی نشاۃ ثانیہ کے باوجود اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

کانفرنس نے مسلمانوں کی اقتصادی ومعاشرتی اصلاح کے لئے

صنعت و حرفت کی ترقی کو ضروری سمجھا اور اس سلسلہ میں ٹیکنیکل تعلیم پر پورا پورا زور دیا، بانی اسلامیہ کالج پشاور صاحبزادہ سر عبد القیوم نے علی گڑھ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۲۵ء میں فرمایا۔

"ہر ملک کی اصل طاقت اس کے صنّاعوں اور ہنروروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ طاقت اصلی دفتروں، منسٹریوں اور گورنروں میں نہیں ہوتی بلکہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو اس حکومت کی ریل اور تار کے سلسلوں، جہازوں اور کارخانوں پر متصرف ہوں۔ تمہارے درمیان لوہاروں موچیوں اور بافندوں کا بڑی تعداد میں ہونا تمہاری بدقسمتی نہیں، بلکہ خوش قسمتی ہے۔ اگر آپ انھیں تعلیم دیں اور انھیں ایسے درجے کا ہنر سکھائیں جیسا کہ یورپ کے ہنرمندوں میں ہے تو آپ نہ صرف اپنی غربت کے مسئلے کو حل کر لیں گے بلکہ اپنے دست و بازو مضبوط کر لیں گے۔"

دہلی کے اجلاس منعقدہ ۱۹۲۶ء میں سر عبد الرحیم نے ارشاد فرمایا۔

"ہر تعلیمی منزل (ابتدائی، ثانوی اور کالجی) کے بعد ان کو ایسے پیشے اور حرفے کی تعلیم دی جائے جس سے فوراً روزگار مل سکے یا جس سے طالب علم کم از کم انسانی ضروریات بہم پہنچانے کے قابل ہو سکے یا اپنے فنی یا ذہنی رجحان کو پورا کر سکے آپ سب واقف ہیں کہ خود ہمارے

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیروی میں ان کے اکثر اصحاب رض اور بڑے بڑے ائمہ اور فقہا یہ روایت قائم کر گئے ہیں کہ جو کچھ اپنے ہاتھ سے پسینہ گرا کر کمایا جائے وہ ہر قسم کی دوسری کمائیوں سے مبارک تر ہے۔ اسلامی شائستگی کی تاریخ کا یہ واقعہ ہے۔ بڑے بڑے علما، صوفیا اور فیلسوف اس حال میں علمی تحقیقات کرتے اور بڑی بڑی کتابیں لکھتے تھے کہ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قسم کی محنت اور ایسے اعلیٰ درجے کے ذہنی کام ایک دوسرے کے عمدہ معین ہیں۔

راولپنڈی کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۴ء میں مولوی سر رحیم بخش نے فرمایا کہ

"میں اپنے نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اپنے کو آزاد اور سود مند پیشوں اور کاموں میں لگائیں اور ملک کے ان ذخائر کی تلاش کریں جو مشترک سرمایہ اور باقاعدہ محنت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انھیں باہر جا کر بڑے بڑے کارخانوں اور عظیم الشان تجارتی دکانوں میں کام سیکھنا چاہیے اور پھر خود اپنا کاروبار جاری کرنا چاہیے۔"

کانفرنس کی مسلسل کوششیں روبہ عمل آئیں اس سلسلے میں علی گڑھ کے اجلاس منعقدہ ۱۸۹۴ء میں جسٹس محمد شاہ دین ارشاد فرماتے ہیں۔

"اس کانفرنس کے طفیل قوم اپنی منتشر قوتوں کو جمع کرنے کے مواقع پیدا کر رہی ہے جس کے باعث ایک ضلع کے اہل دوسرے ضلع کے اور ایک صوبہ کے مسلمان دوسرے صوبہ کے مسلمانوں سے مل کر تبادلۂ خیالات کے ذریعہ نہ صرف قومی اتحاد کو مضبوط کرتے ہیں بلکہ اپنی مقامی عام تعلیمی ضرورتوں کے رفع کرنے اور رفتار زمانہ کے مطابق چلنے کی سب سے بہتر عملی تدابیر سوچتے ہیں۔

کانفرنس کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں شروانی (ف ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں۔

"(اس ادارہ نے) مسلمانوں کو چار دانگ ہند میں تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ قوم کے ہونہار بچوں کے لئے وظائف کا انتظام کیا۔ قومی تعلیم گاہیں قائم کیں۔ تعلیمی مصارف کی بہم رسانی کی سبیلیں نکالیں۔ مسلمانوں کے جمود میں تحریک و سیلان پیدا کیا۔ مسلمانوں کو تعلیم نسواں، و بالغان، معذورین، مدارس

شبینہ، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت اور پیشوں
کی تعلیم اور تربیت جسمانی کی جانب توجہ دلائی۔
ہر جدید تعلیمی تحریک (مثلاً مفت جبری ابتدائی
تعلیم، کلکتہ یونیورسٹی کمیشن وغیرہ وغیرہ) کے
متعلق قوم کو صحیح راستے کی طرف رہنمائی کی۔ گورنمنٹ
کو ہمیشہ مسلمانوں کے ہر قسم کے جائز تعلیمی حقوق
و ضروریات کی جانب متوجہ کیا۔ حتیٰ کہ اس باب
میں دیسی ریاستوں کا دروازہ بھی بار بار کھٹکھٹایا۔
دوسری اسلامی درسگاہوں کے علاوہ مسلم یونیورسٹی
کے قیام کی مساعی جمیلہ میں سب سے زیادہ حصہ
لیا۔ ہر صوبہ کے مختص حالات کے اعتبار سے وہاں
کے مسلمانوں کے اندر تدریج و ترقی تعلیم کی ایسی
راہیں نکالیں جن تک خود اس صوبہ والوں کی نظر
و دسترس نہ تھی۔ مسلمانوں کو ترتیب مجالس کے
نئے ڈھنگ سکھائے۔"

(دیباچہ خطبات عالیہ جلد سوم)

اس سلسلے میں نواب عماد الملک نے دہلی کے اجلاس منعقدہ
۱۹۱۱ء کے خطبہ صدارت میں کیا خوب ارشاد فرمایا۔
"ذرا نظر اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا"

کہ اس کانفرنس کی بدولت اسلامی ہندوستان میں کس قدر انقلاب وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کانفرنس نے ہماری قوم کے سوائے دیگر اقوام کی کوششوں میں ایک نمایاں تحریک پیدا کی ہے جس وقت تک اس کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا کیا اس وقت تک صوبہ سندھ پر ایک بےحسی کا عالم طاری نہ تھا؟ کیا اس کانفرنس کی مساعی جمیلہ سے مشرقی بنگال اور بہار اس خواب گراں سے جو بظاہر لا انتہا معلوم ہوتا تھا، بیدار نہیں ہوئے۔ مدراس، بمبئی اور سنٹرل انڈیا کے مسلمان یکے بعد دیگرے سب کے سب اس سے فیض حاصل کر چکے اور متاثر ہو چکے ہیں۔ اور ان دونوں صوبوں کا ذکر ہی کیا ہے جن کو اس تحریک کے جائے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، میں نہیں جانتا کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے یا نہیں، تاہم میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ میری رائے میں مسلم لیگ بھی اس تحریک کے نتائج میں سے ہے۔"

کانفرنس کے مقاصد عالیہ کو پورا کرنے والی ایک تو وہ تجاویز

ہیں جو سال بہ سال کافی غور و مباحثہ کے بعد عملی شکل میں لانے کے واسطے پیش ہوتی رہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی تدابیر کا سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری رہا، کانفرنس کی ساٹھ سالہ رپوٹیں (۱۸۸۶ تا ۱۹۴۵ء) عالمانہ خطبات صدارت اور اکابرین ملت کی فاضلانہ تقریریں اور خصوصی لکچروں سے بھری پڑی ہیں۔ بیش قیمت نثری ذخیرہ کے علاوہ تاریخی اہمیت رکھنے والی ان قومی نظموں کی بھی کمی نہیں ہے جن کو اپنے اپنے زمانہ کے مشاہیر شعرا نے عصری تقاضوں کے تحت قلم بند کیا اور جوش و خروش کے ساتھ کانفرنس کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا۔ قیام کانفرنس سے پہلے اُردو شاعری جو ہمارے دورِ زوال کی یادگار تھی۔ اس میں مضامین عشق و عاشقی اور ہجر و وصال کی بھرمار تھی تلاش و جستجو کے بعد کہیں کہیں قومی و ملی راگ کی آواز سنائی دی جاتی ہے مگر اس میں پورا زور اور ہم آہنگی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب سراج الدولہ کے المناک حادثہ پر موزوں عظیم آبادی نے یوں اظہار خیال کیا تھا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

اس شعر کو ہم قومی شاعری کا سنگ بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ قومی و ملکی بربادی اور مصائب پر اس زمانے کے شعرا نے جو شہر آشوب لکھے ہیں وہ بھی اس سلسلے کی کڑیاں کہی جاسکتی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی باندازِ خاص قومی گیت ملتے ہیں۔ اسی طرح غالب و مومن وغیرہ کے یہاں یہ چیزیں مل جاتی ہیں مگر گل و بلبل اور صیاد و قفس کی رعایت کا پردہ پڑا رہا۔ مثلاً مرزا غالب دلی کی بربادی پر لکھتے ہیں۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار گر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوشِ خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

سرسید احمد خاں نے جس طرح قومی و ملی شعور بیدار کیا اسی طرح انھوں نے اردو زبان و ادب اور شعر و شاعری کے مزاج کو بھی بدلا۔ اس سلسلے میں ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

"فنِ شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص

ہے اُس سے زیادہ کوئی چیز بُری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب اور ناقص پڑ گیا ہے جس سے تعجب تو طبیعت پر آتا ہے۔ مگر اس کا اثر مطلق دل پر یا خصلت میں یا اس انسانی جذبے میں جس سے ذرا متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"شاعر کے ذہن میں صرف وہی چند محدود خیالات جمع ہیں جن کو اگلے شعراء باندھ گئے ہیں۔ اور فن شاعری کی تکمیل کے لئے اپنی معلومات کو وسعت نہیں دی اور صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کی عادت نہیں ڈالی"۔

سر سید احمد خاں کے یہی خیالات منظم و مربوط اور مکمل و مدلل شکل میں "مقدمہ شعر و شاعری" کی صورت میں مولانا حالی سے ظہور پذیر ہوئے۔ اسی زمانے میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی اور جدید خیالات کی اشاعت کیلئے اس انجمن کی تحریک پر ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں مولانا حالی نے بہ تائید مولوی محمد حسین آزاد مشاعرے شروع کئے جن میں کسی مخصوص عنوان پر شعراء اظہار خیال کرتے تھے۔ مولانا حالی اور آزاد کی نظمیں خاص طور سے مقبول ہوئیں۔ سر سید احمد خاں

رقمطراز ہیں۔

"مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمہ ڈائریکٹر پنجاب کی کوششوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ اُن کی مثنوی حب الوطنی اور مثنوی مناظرۂ رحم و انصاف جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے۔ درحقیقت ہمارے علم و ادب میں ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آبِ زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ بیان میں، انداز میں۔ آمد میں الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں ایسی عمدہ کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔"

۱۸۷۹ء میں مولانا حالی کا لازوال شاہکار مسدس مدوجزر اسلام (مسدس حالی) شائع ہوا جو قومی شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اس سلسلے میں سب سے زیادہ وقیع رائے سرسید احمد خاں کی ہے وہ مولانا حالی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوڑی اور جب ختم ہوئی افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے۔ تو بالکل بجا ہے۔

کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔ بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہاتِ دور از کار سے جو مایۂ نازِ شعراء و شاعری ہے بالکل مبرّا ہے کیونکہ ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشمِ نم پڑھے نہیں جا سکتے" حق ہے۔ جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے"۔

"بے شک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے"۔

غرض جو آواز نظیر اکبر آبادی سے شروع ہوئی جس کو اکبرؔ، حالی اور شبلی نے رنگ دیا وہی آواز اقبال کے روپ میں اُجاگر ہوئی بیسویں صدی عیسوی میں جیسے جیسے قومی تحریکات کا زور ہوا، اسی اعتبار سے قومی نظم نگاری کو فروغ ہوا۔ سر سید احمد خاں بالالتزام ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں شعراء سے قومی نظمیں پڑھواتے تھے مولانا حالی لکھتے ہیں۔

"سر سید احمد خاں مرحوم نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

ہیں ایک حد تک نظمیں پڑھنا جائز رکھا تھا اس زمانہ
میں جبکہ مسلمان اپنے جلسوں سے بالکل غیر مانوس اور ان
کے نتائج سے بالکل بے خبر تھا ضرور تھا کہ ایجوکیشنل کانفرنس
میں کچھ ایسا سامان بھی مہیا کیا جائے جس سے مسلمان بالطبع
مانوس ہوں اور کانفرنس میں نہایت شوق اور رغبت سے
آکر شریک ہوا کریں۔"

کانفرنس کے اجلاس نصف صدی سے زیادہ عرصے تک برِ صغیر میں ہر سال منعقد ہوتے رہے ہیں۔ جن میں تعلیمی، علمی، مذہبی معاشرتی سیاسی غرض ہر اعتبار سے مسلمانوں کے ملک گیر حالات کا جائزہ لیا جاتا رہا۔ اور علی گڑھ تحریک کو فعال و موثر بنانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ان اجلاسوں میں اگر ایک طرف ملک کے مشاہیر، اکابر اور قائدین شریک ہو کر اپنے افکارِ عالیہ سے نوازتے تھے تو دوسری طرف ممتاز شعراء شریکِ بزم ہو کر مردہ دلوں کو گرماتے تھے۔ مشاہیر شعراء میں مولانا حالیؔ، علامہ شبلیؔ، فضل حق آزادؔ، علی حیدر طبا طبائی، نیز نظیر شاہ۔ علامہ اقبالؔ، محمد علی جوہرؔ وغیرہ ہیں جنہوں نے کانفرنس کے اجلاسوں میں اپنی نظمیں پڑھیں اور قومی بیداری میں حصہ لیا، بعض ایسے حضرات بھی شریک نواسنجی ہوئے۔ جن کی شاعرانہ حیثیت تو مسلّم ہے مگر ان کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو دوسرے لوگوں کو ہوئی ان بزرگوں نے بھی اپنی منظومات کے ذریعہ قومی شعری ادب میں معتدبہ اضافہ کیا۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس (کراچی) نے طے کیا کہ ان تمام منظومات کو بہ تفصیل و شرح مرتب کر کے شائع کیا جائے کیونکہ یہ نادرالوجود نظمیں آج بھی اتنی ہی کارآمد ہیں جتنی پہلے تھیں۔

ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے اجلاس کی مختصر کیفیت نظم بند کی گئی ہے تاکہ ماحول اور زمانہ کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے بعد صدرِ اجلاس کے حالات لکھے گئے ہیں۔ نہایت ضروری رزولیوشن بھی نقل کر دیئے گئے ہیں تاکہ ان کوششوں کا اندازہ ہو سکے جو اس تحریک کے سلسلہ میں آئیں، بعض مواقع پر صدر کے خطبے کے ضروری اور اہم اقتباسات بھی دے دیئے گئے ہیں۔ آخر میں ان شعراء کے حالات شامل کئے ہیں۔ بعض کے حالات بہم نہ ہو سکے۔ لیکن ایسے چند ہی حضرات ہیں۔ افسوس ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا مکمل ریکارڈ پاکستان میں موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کانفرنس کی سالانہ رپورٹیں جو اس کتاب کی اساس ہیں وہ بھی معدودے چند ہی دستیاب ہیں لیکن یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ مذکورہ رپورٹوں میں موجود قومی نظموں کو راقم نے اپنے قیامِ علی گڑھ کے زمانہ میں رفیقِ محترم جناب حکیم شریف الزماں صاحب شریف اکبرآبادی مرحوم سے علیحدہ نقل کرا لیا تھا اور وہ میرے پاس بطور ایک قیمتی سرمایہ کے محفوظ تھیں۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۹۳۶ء تک کانفرنس کے رزولیوشنوں کا مجموعہ "ترقیِ کانفرنس" جس میں اجلاسوں کا مختصر حال بھی درج تھا۔ اور ۱۸۸۶ء تا ۱۹۲۷ء صدر صاحبان کے خطبات اور ان کے اجمالی حالاتِ زندگی پر ایک مشتمل کتاب

خطباتِ عالیہ' (ہر سہ حصص) بھی پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے کتب خانہ میں موجود نہیں۔ ان اہم ماخذوں کی مدد سے نیز ۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۰ء علی گڑھ میں اور ۱۹۵۱ء تا ایندم ادارہ سے شب و روز قریب ترین وابستگی کی بنا پر حاصل شدہ ذاتی تاثرات و مشاہدات کے سہارے اس کتاب کا مرتب ہو جانا ممکن ہو سکا۔ وہ شعرائے کرام جن کی نظمیں ہیں ان کے حالات میرے شریکِ تالیف عزیز گرامی قدر پروفیسر محمد ایوب قادری نے کافی تلاش و جستجو سے جمع کئے جس کا انھیں بدرجۂ اتم ملکہ ہے۔ عزیز موصوف جس عزم و ہمت سے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں میرا حقِ رفاقت ادا کرتے ہیں وہ میرے لئے حد درجہ لائقِ تشکر و امتنان ہے۔

آخر میں گذارش ہے کہ اس کتاب کو "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے جو اس کا مناسب ترین نام ہو سکتا تھا۔ ناظرین کو اس کتاب میں علی گڑھ تحریک کی نہایت واضح تصویر نظر آئے گی اور امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس کو ایک تاریخی دستاویز کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

(اگست ۱۹۶۰ء)

یادوں کی برات

جناب جوش ملیح آبادی کی ۷۵۲ صفحات کی اس مبسوط کتاب کا شمار ۱۹۷۰ء کی مشہور کتابوں میں ہے، اس کے مطالعہ سے نظم کی طرح نثر میں بھی جوش صاحب کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ زبان و بیان کی ندرت اور ولولہ انگیزی دیدنی ہے۔ ادب و انشاء کے صدہا شہ پارے لولو و مرجان کی طرح فروزاں ہیں۔

لیکن اس نہایت عمدہ کتاب کو جوش صاحب نے امریکن اور یوروپین فحش نگار مصنفین کی تقلید میں زندگی کے ناقابل بیان حالات کا نگارخانہ بنانے کی جو کوشش کی ہے وہ ہمارے مشرقی اور اسلامی مزاج و روایات کے قطعاً منافی ہے۔ جسم انسانی کے سب حصوں کی نمائش نہیں کی جاتی بستر پوشی لازمۂ شرافت ہوتی ہے۔ جوش صاحب نے مزے لے لے کر نہ صرف اپنے کردار کے گھناؤنے پہلوؤں کی عکاسی کی بلکہ اپنے والد بزرگوار تک کی جامہ دری کر ڈالی حکیم صاحب عالم۔ نواب جعفر علی خاں آثر اور مولانا عبداللہ عمادی

جیسے بکثرت آبرو داروں کی ایسی آبروریزی کر دی کہ وہ کہیں کے نہ رہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں سے ان کی ذات کو فوائد حاصل ہوئے ان کے خلاف ایک لفظ نہ لکھا۔

اپنے سب محسنوں کو بھی نوازنے سے قاصر رہے۔ مثلاً صہبا لکھنوی مدیر "افکار" نے جوش صاحب کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ مگر اس بیچارے کے اعتراف خدمات میں ایک لفظ نہ لکھا۔ پوری کتاب اُس دُکھیا کے ذکر سے خالی ہے۔ عہدِ حاضر کے شاعر انقلاب فیض احمد فیضؔ بھی غالباً معاصرانہ چشمک کی وجہ سے نظر انداز ہیں۔

کتاب "یادوں کی برات" کے سلسلہ میں یہ امر لائق ذکر ہے کہ اس کو جو بھی خریدتا ہے۔ اپنے خاندان کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے چھپا چھپا کر پڑھتا ہے اور تالے میں بند کر کے رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اشاعت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کاش مصنف کو اللہ یہ توفیق دیتا کہ وہ "ساقی" کے "جوش نمبر" کا "صداقت نامہ" لکھنے کے بجائے اپنی آپ بیتی کو اس طرح ترتیب دیتے کہ اس کی جادو نگاری ہر طبقہ و خیال کے لوگوں کے واسطے یکساں قابل استفادہ ہوتی۔

(جون ۱۹۷۱ء)

"تاریخی شہ پارے"

اس کتاب کے فاضل مصنف جناب مرزا اظہر برلاس لکھنؤ کے مشہور خاندانِ "تصلحا" میں پیدا ہوئے اور کلکتہ میں انگریزی کی تعلیم حاصل کی کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۱۶ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن (مع وظیفہ) انٹرمیڈیٹ ۱۹۱۸ء فرسٹ ڈویژن (مع وظیفہ) اور ۱۹۲۰ء میں کلکتہ کے مشہور پریسیڈنسی کالج سے بی اے (مع انعامات) بعد ازاں جنوری ۱۹۲۴ء میں بی ایل کا امتحان پاس کیا۔

دورانِ طالب علمی مرزا صاحب انگریزی کے بہت اچھے مقرر تھے۔ اس زمانہ میں کالجوں میں اُردو کی تقریروں کا بہت کم رواج تھا۔ ہمارے مرحوم وزیر اعظم سید حسین شہید سہروردی صاحب عام طور سے مرزا صاحب کو یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ (کلکتہ) اور وائی۔ ایم۔ سی۔ اے (کلکتہ) کے مباحثوں میں ہندوؤں اور عیسائیوں کے مقابلے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ سہروردی صاحب مرحوم اس زمانہ میں مسلّمہ طالب علم لیڈر تھے اور ایسے مباحثوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔

ان مقابلوں کے تجربوں کے بعد مرزا صاحب نے اپنے دوست الطاف حسین صاحب مرحوم کے تعاون سے جو بعد کو "ڈان" اخبار

کے ایڈیٹر اور بچھر پاکستان کے وزیرِ صنعت ہوئے۔ ایم۔ وائی۔ ایم اے (مسلم ینگ مینس ایسوسی ایشن) قائم کی تاکہ نوجوان مسلم طلباء کو فنِ تقریر مباحثے میں تیار کیا جا سکے۔ اس ایسوسی ایشن کے صدر سید طارق امیر علی منتخب کئے گئے جو رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب ممبر پریوی کونسل کے چھوٹے صاحبزادے تھے اور بعد کو کلکتہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ آنریری سکریٹری مرزا صاحب منتخب ہوئے کلکتہ کے مسلمانوں کے مشہور علمی و ثقافتی مرکز مسلم انسٹی ٹیوٹ کے بھی مرزا صاحب بہت سرگرم رکن تھے۔ تا آنکہ ۱۹۲۳ء میں اس کے بلا مقابلہ آنریری سکریٹری منتخب ہو گئے۔

اسی زمانے میں کلکتہ یونیورسٹی کے مشہور وائس چانسلر سر آشوتوش مکرجی نے سنڈیکیٹ سے یہ پاس کرا دیا کہ بنگلہ زبان صوبۂ بنگال کی بلا تفریق ذریعۂ تعلیم مان لی جائے، مرزا صاحب نے بحیثیت سکریٹری مسلم انسٹی ٹیوٹ مخالفت کی اور ان کی تجویز کی ابو القاسم فضل الحق مرحوم، مولانا ابو القاسم بردوانی مرحوم اور حسین شہید سہروردی مرحوم نے تائید کی اور وہ تجویز باوجود مخالف، غالب اکثریت سے پاس ہو گئی اور ہندوؤں کی سازش کے مطابق بنگلہ زبان اس وقت مسلمانوں پر ٹھونسی نہ جا سکی۔

علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے علاوہ مرزا صاحب کو ورزش اور کھیلوں کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ مسلم فٹ بال کلب کلکتہ کے موصوف

کئی سال تک سکریٹری اور کپتان رہے۔ اور اپنے زمانے کے اچھے کھلاڑیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

کلکتہ سے واپسی کے بعد بہرائچ (اودھ) میں وکالت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد بار ایسوسی ایشن کے وائس پریذیڈنٹ اور مسلم لیگ کے سکریٹری ہو گئے کچھ عرصہ کے بعد بہرائچ میونسپل بورڈ کے بلامقابلہ چیرمین منتخب کر لئے گئے۔ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۳ء ۵ سال اس عہدہ پر فائز رہے۔

مرزا صاحب کو چونکہ شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اس لئے سیاست کی چپقلش سے بہت جلد گھبرا گئے۔ اور موقع ملتے ہی ریاست جے پور (راجستھان) میں بحیثیت ڈسٹرکٹ و سیشن جج چلے گئے۔ اور میونسپل بورڈ کی چیرمینی سے استعفے دیدیا جو بورڈ کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا۔

جے پور تین سال رہنے کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب مرحوم نے ۱۹۴۶ء میں مرزا صاحب کو "ڈان" دہلی کا جنرل منیجر مقرر کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا تو مرزا صاحب اسی سال ستمبر میں دہلی سے پاکستان آ گئے اور ۱۹۴۸ء میں میاں افتخار الدین صاحب مرحوم نے ان کو "پاکستان ٹائمز" لاہور کا جنرل منیجر مقرر کر دیا۔ چند ماہ کے بعد ہی مرزا صاحب گورنمنٹ پنجاب کے محکمۂ "اسلامی تعمیر نو" میں بحیثیت پبلسٹی آفیسر مقرر ہو گئے۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں جب وہ محکمہ ٹوٹ گیا تو مرزا صاحب اپنے اعزہ سے ملنے اور اپنی جائداد کی دیکھ بھال کے لئے اپنے وطن لکھنؤ چلے گئے اور دو تین ماہ ہندوستان میں رہنے کے بعد لوٹ آئے۔ اسی سال لاہور سے کراچی آگئے اور سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار "نیشن" نکالا جو دو سال جاری رہنے کے بعد سنہ ۱۹۵۱ء میں مختلف وجوہ سے بند ہو گیا۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان کے ڈی۔ ایف۔ پی میں مقرر ہو گئے۔ اور بعد کو انفارمیشن ڈپارٹمنٹ (حکومت پاکستان) میں بحیثیت انفارمیشن آفیسر تقرر ہو گیا۔ اس سلسلہ میں جب آپ پبلک سروس کمیشن کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے پورے پاکستان میں انھیں اول نمبر پر منتخب کیا۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں وزارتِ اطلاعات راولپنڈی منتقل ہو گئی تو مرزا صاحب نے خانگی ضروریات سے مجبور ہو کر استعفےٰ دے دیا مگر جلد ہی کے۔ڈی۔اے میں چیف پبلک ریلیشن آفیسر کے منصب پر فائز ہو گئے۔ جہاں سے سنہ ۱۹۶۴ء میں سبکدوش ہوئے۔

باوجود گوناگوں مصروفیات کے مرزا صاحب کی دلچسپی علمی تحقیق و تفتیش، بالخصوص تاریخ سے رہی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۰ء سے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سرگرم عمل جوائنٹ سکریٹری اور لائف ممبر ہیں۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں میرے ساتھ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس میں بھی پیش پیش رہے اور اس کے لائف ممبر اور اکیڈمی آف ایجوکیشنل

ریسرچ کے چیئرمین ہیں۔

۱۹۵۳ء میں ایرانیان ٹکنیکل اسکول قائم کیا اور اس وقت سے مسلسل اس کے چیئرمین ہیں۔

مرزا صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ عبداللہ کالج، شمالی ناظم آباد ہے جس کو ۱۹۶۶ء میں قائم کیا اور اب وہ اپنا پورا وقت کالج مذکور کے چیئرمین کی حیثیت سے اس کی بہبود و ترقی میں صرف کرتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا فطری ذوق اس پر مستزاد ہے۔

مرزا علی اظہر برلاس صاحب کی عمر اس وقت ستر سال کے قریب ہے اور ماشاء اللہ بہت اچھی صحت ہے۔ —— نہایت گورے چٹے اور وجیہہ و شاندار شخصیت کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ بے داغ طرزِ زندگی اور صاف سچے آدمی ہونے کی وجہ سے ہر طبقہ و خیال کے لوگوں میں یکساں معزز و محترم سمجھے جاتے ہیں۔ سیرۃً بے حد وسیع المشرب اور روشن خیال ہیں۔ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر کسی قسم کی دوئی کا احساس نہیں ہوتا۔ سستی ہر دلعزیزی اور منافقانہ وسیع النظری سے بھی آپ کو دلی نفرت ہے۔ ان کا ظاہر اور باطن ہمیشہ سے ایک جیسا ہے، چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش، صاف سچی اور کھری بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتے۔

کردار کی ان خصوصیات کے ماسوا مرزا صاحب کا علم و فضل ہے جو انہوں نے پچاس سال کی محنت شاقہ اور گوناگوں تجربات سے حاصل کیا ہے۔

اور جس نے انھیں بلامبالغہ کندن بنا دیا ہے۔ علمی تحقیق و تدقیق میں مسلسل لگے رہتے ہیں۔ اور نوادر کے ساتھ کچھ نہ کچھ لکھتے بھی رہتے ہیں۔ چنانچہ کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا جو ان کا کوئی نہ کوئی فکر انگیز مقالہ یا مضمون انگریزی اردو کے معیاری اخبارات و رسائل میں شائع نہ ہوتا ہو۔ لیکن جیسی کہ اونچے قسم کے اہل علم حضرات کی عام کمزوری ہے۔ ہمارے مرزا صاحب نے یوں تو ہزاروں مضامین و مقالات لکھ ڈالے مگر کوئی کتاب اب تک نہ لکھی جس سے ان کو اور ان کے کام کو لقائے دوام حاصل ہوتا۔

بمصداق "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند"

اسی احساس کے تحت ریسرچ اکیڈمی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے اربابِ بست و کشاد نے طے کیا کہ مرزا صاحب محترم کے منتخب تاریخی مقالات کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

یہ مقالے زیادہ تر انگریزی میں تھے جن کا ہمارے معزز رفیقِ کار جناب اخلاص حسین زبیری ایم اے نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جس کے لئے موصوف کی محنت اور فنی مہارت لائق داد ہے۔

تاریخی مضامین کا یہ مجموعہ جناب مرزا علی اظہر صاحب برلاس کے تحقیقی مطالعوں کا نتیجہ ہے۔ موصوف ایک علمی خانوادہ کے فرد ہیں۔ اور علمار و صلحا کی صحبت میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے تاریخ سے آپ کو خاص دلچسپی رہی۔ اسی بناء پر زیرِ نظر مجموعے میں زیادہ تر مضامین تاریخی ہیں۔

انگریزوں کی بے ایمانیوں اور مظالم کے واقعات فاضل مصنف نے اپنے بزرگوں سے سُنے ہیں۔ ان کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ یہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمان رئیسوں کو اس قدر بدنام کیا کہ ان کی دیسی رعایا کی ہمدردی اپنے رئیسوں سے جاتی رہی۔ اور اس طور سے زمین تیار کر کے جب ریاستوں کو سلطنت برطانیہ میں شامل کر لیا تو نشانۂ ملامت بننے کے بجائے الٹی ان کی تعریف و توصیف ہونے لگی کہ انگریزوں نے غریب و مظلوم عوام کو ایسے عیاش رؤسا کے پنجہ سے چھڑا کر تباہ حال رعایا پر احسان عظیم کر دیا۔

باشندگانِ اودھ کی چونکہ بچپنے سے سپاہیانہ اُٹھان اور تربیت تھی اس لئے "بنگال آرمی" میں زیادہ سے زیادہ اودھ کے باشندے انگریزی سپاہ میں بھرتی کئے گئے جنہوں نے آگے چل کر برطانوی فتوحات کا جھنڈا افغانستان سے لے کر برما تک اور پنجاب و نیپال سے بھوٹان تک گھرا کر دیا۔ اس کی تھوڑی بہت تفصیل مرزا صاحب کے تحقیقی مقالہ "اودھ، بنگال آرمی کا گہوارہ" میں ملے گی۔

اودھ کے باشندوں کی بہادری و شجاعت کے کارنامے مقالہ اودھ کی جدوجہد آزادی ۵۹-۱۸۵۷ء میں ذرا تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اور مرزا صاحب نے چونکہ زیادہ تر فارسیٹ کے مطبوعہ سرکاری مراسلوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ جو ملٹری ڈپارٹمنٹ پریس کلکتہ سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس لئے ان واقعات کی صداقت میں

کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اودھ کے سپاہیوں کی بے جگری اور بہادری کے حیرت انگیز چشم دید واقعات جو خود انگریز افسروں اور سپاہیوں نے بیان کیے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ اگر ہندوستانی سپاہیوں کی صحیح قیادت ہوتی تو کم از کم اودھ سے جہاں کے باشندوں نے صرف دس روز میں پورے صوبے سے انگریزوں کی حکومت کو ختم کر دیا تھا۔ اس کا استیصالِ کُلّی ہو جاتا۔

۱۸۵۷ء ۔۵۹ء سے بہت پہلے انگریزوں نے تہذیب و تمدن کے علمبردار ہونے کے باوجود اپنی تجارت کو فروغ دینے میں ہندوستانیوں پر جو دردناک مظالم ڈھائے، ان کی المناک کہانی مرزا صاحب نے اپنے مضمون "ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنگال کی صنعتوں کا گلا گھونٹ کر تباہ کرنا" میں سنائی ہے۔ اب بھی اس ظلم و ستم کو سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں! اور ان مظالم کے ایسے ایسے شواہد پیش کیے ہیں کہ انگریزوں کے پشتینی کاسہ لیس بھی ان کی تردید نہیں کر سکتے۔

مقالہ "وسطِ ایشیا اور پاکستان کے باہمی رشتے" سے لائق مصنف کی وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ صدہا سال کے تاریخی واقعات کے سمندر کو جناب مرزا صاحب نے کس طرح کوزے میں سمویا ہے۔ اس اجمالی خاکے میں حتی الامکان کوئی اہم واقعہ چھوٹنے نہیں پایا ہے صدیوں کے واقعات پر یہ طائرانہ نظر خاص طور پر دلچسپ اور جاذبِ نظر ہے۔

یہ چند مقالوں کا ذکر ہے۔ کتاب میں شامل ہر مقالہ معلومات افزا اور بصیرت افروز ہے اور اسی لئے ہم نے اس مجموعہ کا نام "تاریخی شہ پارے" تجویز کیا ہے۔ توقع ہے کہ تاریخ کے طلباء، اساتذہ نیز عام قارئین اس سے بھرپور فائدہ اُٹھائیں گے۔ (ستمبر ۱۹۷۱ء)

"سوانحات المتاخرینِ آنولہ"

العلم، شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۲ء میں

برادر مکرم پروفیسر محمد ایوب قادری کا ایک مفصل مضمون بعنوان "مشاہیر آنولہ" شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے جناب حکیم عبدالغفور صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب "سوانحات المتاخرین آنولہ" کا سیر حاصل تعارف کرایا تھا یہ کتاب خود قادری صاحب کی تحریک و تشویق پر مصنف علام نے ۱۹۵۰ء میں لکھی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی طباعت میں بوجوہ غیر معمولی تاخیر ہو گئی تا آنکہ فاضل مصنف کا اگست ۱۹۶۴ء میں بعمر ۸۵ سال آنولہ میں انتقال ہو گیا۔ اور اب اواخر ۱۹۷۲ء میں کتاب کے چھپنے کی نوبت آ رہی ہے تو وہ اس جہاں میں موجود نہیں ہیں۔ غنیمت ہے کہ ایوب قادری صاحب نے اس قیمتی مخطوطہ کو اپنے پاس محفوظ رکھا ورنہ اگر وہ ضائع ہو جاتا تو یہ ایک بڑا علمی حادثہ ہوتا۔ کتاب میں تقریباً دو سو مشاہیر

کے حالات درج ہیں جن میں قدیم اور ہمعصر علماء، حکماء، صلحاء، رؤسا، تجار، صناع اور دیگر باکمالوں کے حالات تلاش و تحقیق اور شرح و بسط کے ساتھ یکجا کئے گئے ہیں. علاوہ بریں آنولہ کی عہدِ قدیم، عہدِ وسطیٰ اور عہدِ جدید کی تاریخ۔ تاریخی عمارات جغرافیائی کیفیت اور اس مقام کی کچھ خاص خصوصیات بھی ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں. مولف نے اپنے خاندانی حالات بھی لکھے ہیں۔ اور سب سے آخر میں چند ضمیمہ جات ہیں جن میں سے ضمیمہ ۳ "آنولہ مورخین کی نظر میں" اور ۴ "تارکین آنولہ یعنی ان اصحاب کی فہرست شامل کتاب کی گئی ہے جو ترک وطن کرکے پاکستان کے مختلف مقامات پر مقیم ہیں. فہرست مذکور میں پروفیسر ایوب قادری صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی نعمت اللہ قادری بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے تصنیف و تالیف اور اشاعتِ کتب میں نام پیدا کرکے اپنے مرز بوم آنولہ کا نام روشن کیا ہے۔

مجھے آنولہ اور اہالیان آنولہ سے ہمیشہ محبت رہی. سترہ میل کے فاصلہ پر بریلی سے علی گڑھ ریلوے لائن پر آنولہ کا اسٹیشن آتا تھا. جہاں میں بارہا گیا۔ سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں "حیاتِ حافظ رحمت خاں" کی ترتیب کے سلسلہ میں حاضری دی اور میں نے اس موقع پر تمام تاریخی عمارات کو تفصیل سے دیکھا اور ان کے فوٹو لئے۔ اس کے بعد بھی کسی نہ کسی عنوان سے میں آنولہ جاتا رہتا تھا

اور جناب شیخ رسول احمد صاحب۔ جناب حاجی تنویر احمد صاحب اور خان بہادر حکیم معظم علی صاحب عرف ننھے میاں صاحب کا مہمان ہوتا تھا۔ ان دوستوں اور بزرگوں کی تواضع اور تہذیب وشائستگی کا معیار مثالی تھا۔ اور ان کی ذات سے اس مردم خیز اور خوش سواد تاریخی بستی کی بہت سی روایات وابستہ تھیں چنانچہ کتاب زیر نظر میں بھی ان صاحبوں کا ذکر ہے۔ سب سے آخری بار تقسیم ملک کے بعد یو۔پی پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (جس کا میں آنریری جوائنٹ سکریٹری تھا) کا سالانہ اجلاس زیر صدارت حضرت مولانا حسرت موہانی منعقد ہوا۔ یہ اجلاس جناب حاجی تنویر احمد صاحب کی کوٹھی کے نہایت وسیع وکشادہ صحن میں کیا گیا تھا۔ اتنا بڑا صحن تھا کہ اس میں سیکڑوں آدمیوں کے بیٹھنے کے باوجود کافی گنجائش باقی رہی۔

مذکورہ اجلاس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جلسوں کے فارغ اوقات میں بانک۔ بنوٹ۔ لاٹھی اور شمشیر زنی کے مقابلے بھی کرائے گئے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان میں حصہ لینے والے لوگ اس گئے گذرے زمانے میں بھی کس قدر دیو ہیکل اور شہ زور تھے۔ ان لوگوں نے مہارت فن کا مظاہرہ ایسے جوش وخروش کے ساتھ کیا کہ ایک دوسرے کے مدمقابل کی جان کا بچ جانا معجزہ معلوم ہوتا تھا۔

اجلاس کانفرنس ہی میں غالباً پہلی بار میری ایوب قادری صاحب سے ملاقات ہوئی جنہوں نے ایک کمرہ میں اپنے ذاتی ذخیرۂ کتب اور دیگر نوادرات کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ یہ اتفاقی ملاقات ایسی مبارک ثابت ہوئی کہ ایوب صاحب یہاں پاکستان میں اب میرے مستقل رفیق کار ہیں۔ اور شاید ہی کوئی مہینہ خالی جاتا ہوگا جو دس پانچ مرتبہ ان سے ملنا نہ ہوتا ہو۔

آنولہ کی تاریخی اور معاشرتی خصوصیات کو روہیل کھنڈ کا مورخ ہونے کے باوجود میں ان سطور میں دُہرانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ تمام اہم اور ضروری معلومات خود اس کتاب میں موجود ہیں جس کا مقدمہ سپرد قلم کرنے کی مجھے عزت بخشی گئی ہے۔ ایک بات البتہ ضبط تحریر میں لانا میرے لئے ناگزیر ہے اور وہ یہ کہ روز افزوں صنعتی، تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں کی بدولت شہروں کے فروغ پانے سے قبل برصغیر پاک و ہند کی تحصیلیں اور قصبات ہی علم و دانش اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھے۔ وہیں سے بڑے بڑے نبرد آزما، مدبرین، مصنفین، مفکرین، اہل اللہ، علمائے دین، شعرائے کرام اور قومی زندگی میں یادگار کام کرنے والے لوگ پیدا ہوتے تھے۔ ایسی ہی تحصیلوں اور قصبات میں سے آنولہ کی بھی ایک منفرد حیثیت تھی۔ جس کی یہ کتاب "سوانحات المتاخرین آنولہ" آئینہ دار ہے۔ توقع ہے کہ اس کو نہ صرف روہیل کھنڈ سے تعلق رکھنے والے

لوگ بلکہ عام قاری بھی بالخصوص اس برّصغیر کے مورّخین نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔ پروفیسر محمد ایوب قادری اور ان کے برادر عزیز نعمت اللہ قادری لائق ستائش ہیں کہ انہوں نے یہ نہایت مفید خدمت انجام دی۔

کراچی ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۲ء

افکارِ فیض احمد فیضؔ

جناب فیض احمد فیضؔ (سیاسی نظریات سے قطع نظر) عہدِ حاضر کے مشہور و معروف دانشور ہیں۔ آپ کی منظوم تخلیقات کی دھوم ہے۔ ہر طبقہ و خیال کے پڑھے لکھے لوگ، بالخصوص نوجوان نہایت ذوق و شوق سے ان کو پڑھتے ہیں اور حرزِ جان بنا کر رکھتے ہیں۔ فیضؔ صاحب نہ صرف بہت بڑے شاعر ہیں بلکہ انہوں نے جب وہ روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کے چیف ایڈیٹر تھے، انگریزی صحافت میں بھی شہرت حاصل کی۔ عربی کے علاوہ انگریزی کے بھی ایم اے ہیں اور انگریزی لکھنے میں اُن کی اس قدر مہارت قابلِ رشک ہے۔

فیضؔ صاحب کی اُردو نثر نگاری کا ہمیں تجربہ نہ تھا، یہ خوش آیند تجربہ ان کی کتاب "صلیبیں مرے دریچے میں" یعنی ایامِ اسیری کے ایک سو پینتیس ۱۳۵ خطوط کے مجموعہ کو پڑھ کر ہوا، جسے پاک پبلشرز لمیٹڈ کراچی نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے اشاعت پذیر ہونے کا تمامتر

کریڈٹ ادارۂ یادگارِ غالب والے مرزا ظفر الحسن صاحب کو ہے۔ جنہوں نے محترمہ بیگم فیض کے نام لکھے ہوئے انگریزی خطوط کا اردو ترجمہ خود فیض صاحب سے بڑی بھاگ دوڑ کر کے کرالیا۔ کتاب کے شروع میں مرزا صاحب نے ایک ولولہ انگیز مقدمہ "کتاب اور صاحبِ کتاب کی کہانی" کے عنوان سے سپردِ قلم کیا ہے۔ جس سے کتاب کے منصۂ شہود پر آنے کی دل آویز داستان مطالعہ میں آجاتی ہے۔

خود فیض صاحب نے اپنے انگریزی خطوط کو اُردو کا جامہ پہنانے میں قلم کی جو جادوگری کی ہے وہ دیدنی ہے۔ اگرچہ خود ان کو اس سلسلہ میں جو مشکل پیش آئی اس کی بابت لکھتے ہیں کہ :-

"ایک زبان کے منفرد الفاظ کا ترجمہ کچھ ایسا مشکل کام نہیں اور مفہوم کی ادائیگی میں بھی کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی لیکن انگریزی کا روزمرہ کا لہجہ اور ہے۔ اور اُردو کا اور ـــــ ہر زبان کی طرح انگریزی کے روزمرہ، محاورے، تلمیحات، ضرب الامثال، کہاوتیں وغیرہ وغیرہ اسی زبان سے مخصوص ہیں اور بہت سی محنت اور تلاش کے بغیر انہیں اُردو میں منتقل کرنا محال ہے۔"

لیکن بکمال چابکدستی فیض صاحب نے "محال" کو "ممکن" بنادیا۔ اور مترجمہ خطوط کو پڑھتے وقت یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی دوسری زبان سے اُردو میں منتقل کئے گئے ہیں۔ ترجمہ کی اس سے بڑھ کر

اور کیا خوبی ہو سکتی ہے، "روزمرّہ" محاورے، تلمیحات، ضرب الامثال، کہاوتیں اور زبان و بیان کی ساری نزاکتیں۔ لچک اور لوچ اپنی اپنی جگہ نظر افروز ہیں۔

فیضؔ صاحب نے مذکورہ خطوط۔ حیدر آباد۔ کراچی۔ اور منٹگمری کی جیلوں سے لکھے ہیں اور ان کا سلسلہ ۷ / جون ۱۹۵۱ء سے شروع ہو کر ۹ / اپریل ۱۹۵۵ء کو اختتام پذیر ہوا ہے۔ عالمِ اسیری میں ایک عالم، مفکر اور حساس شخص کے کیا جذبات ہوتے ہیں ان کی نہایت اچھوتی عکاسی کی گئی ہے۔ فیضؔ صاحب چونکہ فطرتاً رجائیت پسند واقع ہوئے ہیں اس لئے جیل کے تنگ و تاریک کمروں اور بھیانک در و دیوار میں بھی انہیں "بچشمِ مجنوں" حُسن نظر آتا ہے۔ موسموں کے تغیرات اور صبح۔ دوپہر۔ شام یا شب کی تاریکی کا جیسا سماں کھینچا ہے اور مختلف اوقات میں ؎

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کی جو تصویر کشی کی ہے۔ نیز پھولوں اور سبزہ کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں جیسی جودت و جولانی پیدا ہوتی ہے اس کو اگر ایک بڑے آرٹسٹ کے موئے قلم کا شاہکار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ایک بڑے ادیب کی بڑائی کا راز صرف اس چیز میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ اپنے محسوسات و وارداتِ قلبی کو کس حد تک الفاظ

کا جامہ پہنانے اور وہ بھی خوبصورت اور حسین الفاظ کا جامہ پہنانے میں کامیاب ہوا ہے۔ کیونکہ "انسان کی زندگی کائنات کا سب سے پوشیدہ راز ہے جس کو سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا اسی نسبت سے دشوار ہے۔" اس خصوص میں فیضؔ صاحب بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے ہیں۔

فیضؔ صاحب نے یہ خطوط اپنی شریک حیات کے نام لکھے ہیں۔ اس لئے ان میں ذاتی باتیں زیادہ ہیں، تاہم تمام انسانوں کی ذاتی باتیں چونکہ بنیادی طور پر قریب قریب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی دلآویزی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ دوسرے کی کہانی یا آپ بیتی اپنی ہی داستان معلوم ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ بیان کرنے پر قادر ہے۔ اور ہم اس کے اظہار سے قاصر ہیں۔

ذاتیات کے ماسوا فیضؔ صاحب کے خطوط میں بکثرت ایسے ادبی شہ پارے موجود ہیں جن کی افادیت عام ہے۔ وہ ہر شخص کے فائدے کے ہیں۔ ان کی قدر و قیمت مکان و زمان اور کسی نسبت و تعلق سے بالاتر ہے۔ وہ ایسے حقائق ہیں جن کو ماضی اور حال کی طرح مستقبل میں بھی دوام حاصل رہے گا۔ دورانِ مطالعۂ کتاب ہم ایسے تمام ادب پاروں پر نشان لگاتے رہے۔ اور جب کتاب ختم ہوگئی اور ہم نے نشان زدہ عبارتوں کو یکجا کر کے پڑھا تو ہمیں ایک بہت ہی اونچی چیز ترتیب اور تسلسل کے ساتھ نظر آئی۔ ایک دردمند، حساس اور انتہائی قابل انسان یعنی فیضؔ کے افکار عالیہ یکجا ہدست ہوگئے۔ ان سے جو اسرار و حکم اور

رازہائے عبرت و موعظت ہم پر منکشف ہوئے ہم چاہتے ہیں کہ ان میں اپنے ناظرین کو بھی شریک کریں۔ توقع ہے کہ ان کے مطالعہ سے جس قدر ہم متاثر ہوئے ہیں۔ اسی قدر ناظرین کرام بھی اثر پذیر ہوں گے۔[۱]

(دسمبر ۱۹۷۲ء)

---

[۱] یہ "اذکار" العلم اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئے ہیں۔

شخصیات

سرسیدؔ ایک عظیم قومی رہنما

ایک راہ نما کی تعریف یہ ہے کہ وہ بے راہ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ دکھائے۔ وہ عوام کا قائد ہوتا ہے، مقلد نہیں، اس کا مطمحِ نظر ذاتی تفوق کے لئے محض لیڈر بننا نہیں ہوتا بلکہ ضرورت پیش آنے پر بعض اوقات اس کو انتہائی غیر ہردلعزیز بھی ہونا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ اس راہ میں جان تک کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ عوامی رجحانات سے (خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں) مغلوب ہو جانا اور سستی شہرت و ناموری حاصل کر لینا ایک سچے اور مخلص قائد و رہنما کا مسلک نہیں ہو سکتا۔ چاہے اس کی پوری زندگی شدید مخالفتوں کا مقابلہ کرنے میں گذر جائے۔ اپنے جیتے جی حصولِ مقصد میں قطعاً کامیابی نہ ہو اور آخری لمحاتِ حیات تک ناکامی و نامرادی ہی اس کے حصہ میں آئے۔ عہدِ حاضر کی قیادت کی طرح وہ اس کا قائل نہیں ہوتا کہ ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

بلکہ قوم و ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر ہر طرح کی مخالف قوتوں

سے نبرد آزما ہونا اس کا مسلک ہوتا ہے۔ وہ نیم پختہ اذہان کا پابند نہیں ہوتا۔ کسی قیمت پر اپنے موقف سے نہیں ہٹتا۔ اور رائے عامہ کو صحیح رُخ پر لانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتا۔

اس معیار پر سرسید کی شخصیت اور ان کے کاموں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہم اُن کو ایک عظیم رہنما اور قائد پاتے ہیں مثلاً انہوں نے خلوص کے ساتھ اندازہ کیا کہ انگریزی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کسی منصوبہ اور مستحکم تنظیم کے بغیر لڑی جا رہی ہے اور اس کا انجام ہولناک تباہی ہوگا لہٰذا وہ اس میں شریک نہیں ہوئے اور اپنی قوم کو بھی اس سے باز رکھنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں وہ اس قدر بدنام ہوئے کہ دوران ہنگامہ ایک دفعہ وہ چھپتے چھپاتے بجنور سے میرٹھ جا رہے تھے تو راستہ میں بمقام موضع پلانہ و چاند پور آزادی خواہوں نے دو جگہ ان کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھیر لیا۔ بدقت جان بچ سکی۔ دلی میں ان کا گھر بار لٹا عزیز و اقارب مارے گئے مگر وہ اپنی رائے اور روش پر قائم رہے۔ ہنگامہ فرو ہونے پر حکومت وقت نے بطور صلۂ خدمات ان کو ایک بڑی جاگیر کی پیش کش کی لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ کلکٹر علی گڑھ نے سرسید کی تعریف میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہ چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی۔"

ایسے وقت میں جبکہ انگریز قوم جوش انتقام میں اندھی ہو رہی

تھی۔ سرسید نے رسالۂ اسباب بغاوت ہند تحریر کیا اور حکمرانوں کو ان کی ناانصافیوں سے آگاہ کیا۔ اسی طرح جب ہنٹر نے "وہابی" اور "باغی" مترادف الفاظ قرار دے کر مسلمانوں کے خلاف" ہمارے ہندوستانی مسلمان" جیسی خطرناک کتاب لکھی تو سرسیّد نے اس کی سخت تردید کی۔ عین اس زمانہ میں جب ان کی قوم کو انگریز۔ انگریزی تہذیب اور زبان سے شدید نفرت تھی۔ انہوں نے اپنے ہم قوموں کو مشورہ دیا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے حکومت و سلطنت کے اعلیٰ و ادنیٰ عہدے حاصل کریں اور ملّت کی فلاح کا کام کریں۔ سرسید کی نگاہ دوربین نے اس حقیقت کا اچھی طرح اندازہ لگا لیا تھا کہ مسلمانانِ ہند اپنی بے بضاعتی اور گوناگوں کمزوریوں کی بنا پر انگریز کو فی الوقت ہندوستان سے رخصت نہیں کر سکتے چنانچہ اگر مسلمان انگریزوں سے مسلسل ٹکر لیتے رہتے تو آج برصغیر میں ان کی داستان بھی محفوظ نہ ہوتی۔ سرسید چاہتے تھے کہ انگریز اپنی دماغی اور سائنسی فوقیت کی بنا پر اقصائے عالم پر چھا رہا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو بھی ان ہی ہتھیاروں کو اپنا کر اپنے آپ کو طاقتور بنانا چاہیئے۔

سرسید نے اپنے واسطے قومی خدمت کا پُرخار راستہ ایسے حالات میں تجویز کیا جب قدم قدم پر جان تک کا خطرہ تھا۔ ضبطیٔ جائداد قید اور جرمانہ معمولی باتیں تھیں، خوش قسمتی سے سرسید کو بڑے مخلص اور اچھے ساتھی بھی میسر آ گئے۔ محسن الملک۔ وقار الملک۔ شبلی۔ نذیر احمد۔ حالیؔ

مولوی چراغ علی اور سمیع اللہ خاں جیسے لوگ کسی قوم کو کہاں ملیں گے؟ سرسید نے اپنے نورتنوں سے خوب خوب کام لیا۔ ایک اچھے رہنما کی یہ بھی اعلیٰ خوبی شمار ہوتی ہے کہ وہ سب تعریف صرف اپنے واسطے محفوظ نہ رکھے بلکہ اسے اپنے رفقائے کار میں بھی تقسیم کرے اور ان کی اہلیت کے مطابق ان سے کام لیتا رہے۔ قومی تحریکیں اسی طرح آگے بڑھتی اور پروان چڑھتی ہیں۔

سرسید نے شدید ترین مخالفت کے باوجود اپنی اس رائے سے رجوع نہیں کیا کہ مسلمانوں کو اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ آجکل کفر کے فتووں میں اتنا اثر نہیں ہے جتنا اب سے سوا سو برس پہلے تھا۔ لیکن سرسید آہنی دیوار بنے کھڑے رہے۔ وقت نے بتایا کہ سرسید کی رائے صحیح تھی۔ وہ بلا ترمیم مغربی تعلیم کے حامی نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم سختی کے ساتھ اسلام کے پابند رہتے ہوئے مغربی علوم وفنون حاصل کریں اور ترقی یافتہ اقوام کی صفوں میں کھڑے ہونے کے لائق بن جائیں۔ ایک مرتبہ ایک جلسہ میں جوابی تقریر کے دوران انہوں نے فرمایا کہ

"ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر ایک قوم کہلاتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تب ہی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا اور جس پر تم کو

مرنا ہے اسے قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اگر
کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو
کیا۔ وہ تو ہماری قوم نہ رہا۔ پس اسلام کو قائم رکھ کر
ترقی کرنا قومی بہبود ہے۔ یہ ہی قومی ترقی ہوگی جو تم کو
بھی فائدہ دے گی۔ قوم کی بھی عزت ہوگی اور آنے
والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گی"۔

سرسید نے قومی تربیت کے واسطے محض زبانی جدوجہد نہیں کی بلکہ عملی اقدام بھی کئے۔ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ ۱۸۷۷ء میں قائم کیا گیا۔ اس کالج نے اعلیٰ پایہ کے سیاست داں۔ مصنف۔ ادیب۔ شاعر۔ اور ہونے کے مسلمان شہری پیدا کئے۔ مسلمانوں میں تعلیمی شعور پیدا کرنے اور ان کے تعلیمی مسائل کو اعلیٰ سطح پر طے کرنے کے واسطے انہوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ اس ادارہ کا نام بعد میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہو گیا۔ مسلمانوں کی اولین سیاسی جماعت مسلم لیگ کی بنا بھی اسی کانفرنس کے اجلاس ۱۹۰۶ء منعقد ڈھاکہ میں نواب خواجہ سر سلیم اللہ بہادر اور نواب وقار الملک کے ہاتھوں رکھی گئی۔ یہ قدم ایسی نیک ساعت میں اٹھایا گیا تھا کہ ٹھیک ۴۱ سال بعد قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان قائم کرنے میں مسلمان کامیاب ہو گئے۔

سرسید نے اپنی ذاتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ کثرت سے

اصلاحی مضامین اور مقالے تحریر فرمائے انہوں نے علمی ذوق کی تسکین کے واسطے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ سرسید کی زندگی میں اس سوسائٹی نے تقریباً ۴۰ معرکۃ الآرا کتابیں شائع کیں۔ سرسید کا اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ رسالہ تہذیب الاخلاق قوم، اصلاح کے واسطے بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ سرسید کے جاری کردہ اخبارات و رسائل میں تقریباً وہ سب عنوانات موجود ہوتے تھے۔ جو آج کی صحافت میں مستعمل ہیں مثلاً اہم قومی اور بین الاقوامی خبریں۔ معلوماتی اعداد و شمار، متنوع عنوانات پر مضامین، ایڈوٹوریل۔ ذیلی نوٹ اور مراسلات۔ سرسید کے مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شخصی دل آزاری اور ذاتیات سے اپنے قلم کو ہمیشہ پاک رکھا۔

سرسید کو آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی سے جو عقیدت و محبت تھی اس کا حقیقی اندازہ سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ چار جلدوں میں شائع ہونے کے بعد ہوا۔ مولانا حالیؔ نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ...... وہ اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں

سرسید نے جب اس کتاب کا جواب لندن میں بیٹھ کر خطبات احمدیہ کے نام سے لکھا تو اپنی اس خدمت کے بارے میں نواب

محسن الملک کو تحریر کیا کہ

"اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا ڈبل حج کے برابر سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔"

۱۸۷۰ء میں لندن کے اخبار میں خطباتِ احمدیہ پر ایک انگریز نے لکھا کہ

"عیسائیوں کو ہوشیار ہونا چاہئے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ آنحضرت صلعم کی ذات ان تمام داغوں اور دھبّوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما دامن پر لگاتے ہیں۔"

اس طرح سرسیدؒ نے قوم کو یہ سبق دیا کہ مغربی علوم و فنون حاصل کرنے، حکومتِ وقت سے مصلحتاً دوستانہ ہاتھ بڑھانے کے یہ معنی نہیں کہ اغیار کی مذہبی مداخلت کو بھی خاموشی سے گوارا کر لیا جائے۔

سرسید علیہ الرحمۃ بڑے بالغ نظر بزرگ تھے۔ زبان اور رسم الخط کی تبدیلی کا کسی قوم پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ جب انگریز ہندی اور اُردو کے ذریعہ دو قومی نظریہ کو خاموشی کے ساتھ فروغ دے رہے تھے۔ اس وقت سرسید کی رائے کی حقیقی وقعت آج کی دنیا میں بخوبی ثابت ہو رہی ہے۔ سرسید کو اپنے خیالات پر کس قدر بھروسہ تھا۔ اس کا اندازہ

زیر بحث موضوع پر۔ ان کی کمشنر بنارس مسٹر شیکسپیر سے گفتگو کے ایک اقتباس سے بخوبی ہو سکے گا۔

"میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں (ہندو اور مسلمان) کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا، اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

چنانچہ وقت نے بتایا کہ سرسید کس حد تک اپنے خیال میں صحیح تھے۔ سرسید احمد خاں بہت جلد بات کی حقیقت کو پہنچ جاتے تھے۔ اگر سرسید مانع نہ ہوتے تو پنجاب یونیورسٹی کی حیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے مشرقی دار العلوم جیسی ہوتی۔ جس سے مسلمانانِ پنجاب و سرحد کو دنیاوی فوائد حاصل نہ ہو پاتے۔ اسی طرح ان کے انتقال کے بعد مسلم یونیورسٹی کی بھی شکل وصورت بدلی ہوئی ہوتی۔ سرسید کا فیض ان کی زندگی اور پھر ان کے انتقال کے بعد ان کے لائق جانشینوں کی سعی سے جاری رہا۔ انہوں نے ہندوستان کی پسماندہ

اور ہمت ہاری ہوئی مسلمان قوم کو ایک ایسے راستے پر لگایا جس نے اس کی ترقی کی راہیں کھول دیں۔ اور بالآخر یں اس برصغیر میں اپنا وجود منوانے میں کامیاب ہوگئی۔ سرسید کے علمی کارنامے آج بھی روشنی کا مینارہ ہیں جن سے ہر وہ شخص فیضیاب ہو سکتا ہے جس کے دل میں حقیقی قومی خدمت کا جذبہ موجود ہو۔ دنیا میں اچھے انسانوں کی کمی نہیں۔ قدرت کا یہ انتظام ہے کہ یہ سلسلہ ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ لیکن سرسید جیسی ہمہ گیر۔ اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کی حامل شخصیات شاذ ہی کسی قوم میں پیدا ہوتی ہیں۔ بلاشبہ سرسید ایک عظیم قومی رہنما تھے۔

(مارچ ۱۹۷۱ء)

"وداعِ دوست"

شب کی تاریکی میں جس وقت اے دوست! تمہاری نمازِ جنازہ پڑھی جارہی تھی تو میں تیسری یا چوتھی صف میں تھا اس لئے تمہاری میت کو نہ دیکھ سکا۔ نماز کے بعد تندرست و توانا عزیز احباب تمہارے جنازہ کو ایسی تیزی سے لے کر چلے کہ میں جو کمزور و ناتواں تھا بس اس کی ایک جھلک دیکھ سکا۔ باہر سڑک پر آیا تو تم نظروں سے بالکل ہی دور ہو چکے تھے۔

مگر از خانہ بروں بود کہ شب در کوئش
ہیچ ذوقم زنگاہِ در و دیوار نہ بود

تمہیں شہر سے باہر دس بارہ میل کے فاصلہ پر دفن ہونا تھا۔ رات زیادہ ہو گئی تھی مطلع ابر آلود اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ شدتِ رنج و الم سے دل و دماغ ماؤف تھے، ساتھ جاؤں تو کیسے جاؤں۔ تم جو ہمیشہ سے میری حالت سے واقف تھے۔ شاید تمہاری ہی روح نے مجھے یاد دلایا کہ "کیا کروگے جاکر؟

سب لوگ جس طرح دفن ہوتے ہیں اسی طرح میں بھی دفن ہوجاؤں گا۔"

اس کے بعد میں اپنے گھر آ گیا۔ سوچتا رہا۔ ساری رات ہی سوچتا رہا کہ اب تو سب لوگ تمہیں سپرد خاک کرکے واپس آ گئے ہوں گے۔ اور اس وقت تم سینکڑوں من مٹی کے نیچے اکیلے پڑے ہو گے۔ آسمان پر سیاہ گہرے بادل اور آبادی سے دور بہت دور سنسان قبرستان! شاندار کوٹھی۔ آرام دہ کمرہ نرم بستر صاف ستھرا لباسِ شب خوابی۔ سب کیا ہوا؟

دیا کے قبر میں سب چل دیئے دعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانہ کو

چند ہی گھنٹوں میں تنگ و تاریک قبر، فرش خاک اور سادہ کفن۔ اللہ رے انقلاب۔ کیا دم نکلتے ہی جسم و جان کا رشتہ باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے تو جسم بے جان کو پیوند خاک کرنے کی جلدی کی جا رہی تھی۔

ارے! یہ وہی تو جسم ہے جس کی دن رات حفاظت کی جاتی تھی اور اس کی تزئین و آسائش پر ہمہ وقت کاوش ہوتی تھی۔ اب یہی قیمتی جسم کس قدر بے حقیقت ہو گیا۔ حالانکہ ابھی اس کا ہر حصہ صحیح و سالم ہے لیکن اس کی سلامتی تابہ کے؟ ایک وقت آئے گا کہ اس کا وجود ڈھونڈے نہ ملے گا۔ ایسی فانی چیز سے زندگی میں اس قدر لگاؤ کیوں ہوتا ہے۔ اس کی خاطر پھر اتنے اُلٹے سیدھے کام کس وجہ سے کئے جاتے ہیں۔ قبر کا

نشان رہے گا۔ مگر وہ بھی ایک محدود زمانہ تک۔ علاوہ بریں۔ قبریں قبریں سب ایک سی۔ اس پر تاج محل تعمیر کردو یا اُسے یوں ہی کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ دو۔ رہی میرے دوست یوسف کی قبر تو جب سے وہ وجود میں آئی ہے بارش کی جھڑی لگی ہوئی ہے ابھی تو وہ پختہ بھی نہ ہونے پائی تھی۔

خیر اس بات کو چھوڑو۔ اے ہم نفسو! یہ بتاؤ کہ مرنے کے بعد روح تو باقی رہتی ہے۔ اس پر کیا گذرتی ہے؟ وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ جسم سے وابستگی کے وقت تک وہ جن تفکرات و علائق حیات میں ہر لمحہ اُلجھی رہتی ہے کیا ان سے کوئی واسطہ باقی رہتا ہے یا عالم ہی بدل جاتا ہے۔ مگر اس عالم کا کچھ تو پہلے سے علم ہونا چاہئے۔ اور چونکہ کوئی علم نہیں ہوتا اس لئے قدرتاً انسان مرنے سے ڈرتا ہے۔ اے دوست! تم بھی موت سے خوف زدہ رہتے تھے۔

بزرگوں کے احوال اور مذہبی کتابوں میں حیاتِ بعد الممات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ گنہگاروں کے لئے ہولناک اور نکوکاروں کے واسطے دل آویز۔ لیکن گناہ گار اچھے کام بھی کرتے ہیں۔ اور نکوکاروں سے بھی کچھ گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ اس لئے مستقبل کی طرف سے کسی کو اطمینان نہیں ہوتا۔ اور یہی بے اطمینانی آنے والی ان جانی دنیا کے تصور کو ہولناک بنا دیتی ہے۔

انسانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو وجود باری کا قائل

نہیں۔ بے خوف و خطر زندگی بسر کرتا ہے اور مرنے کو صرف "نیست" ہو جانے سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی آگے کچھ نہیں۔ بس مرے سو مر گئے۔ ایسے لوگوں پر بعض اوقات رشک آتا ہے، مگر معاً حضرت مولیٰ علیؓ کی گفتگو یاد آجاتی ہے۔ جو ان کی ایک دہریہ سے ہوئی تھی کہ خدا کا وجود نکل آیا تو ہم اس کی عبادت کرنے والے نفع میں رہیں گے۔ اور تمہیں خسارہ ہوگا۔

میرے دوست یوسف! تم دیندار شخص تھے، انتقال کے دن بھی تمہاری نماز اور تلاوتِ کلام پاک قضا نہ ہوئی۔ پھر تمہاری اقربا، برادری اور تکلیف میں مبتلا ہر شخص کی بے لوث امداد، تم عالم نہیں تھے لیکن علم دوست اور اہلِ علم کے سچے قدردان و خدمت گزار۔ دوست نواز، متواضع، سیر چشم، وضعدار، نکتہ رس اور بزلہ سنج۔ کیا عجب کہ خدائے بزرگ و برتر تمہاری ان خوبیوں کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ تمہیں اپنے جوارِ رحمت میں مقام رفیع ارزانی کرے اور جس طرح تم دنیا میں کامران نیک نام تھے آخرت میں بھی تمہاری روح کو ابدی سکون و راحت نصیب ہو۔

قیامت کے روز میزانِ عدل میں اچھے اور بُرے اعمال کو تولا جائے گا۔ ایک پلڑے میں نیکیاں اور دوسرے میں برائیاں۔ ان پلڑوں کی اونچائی اور نیچائی دیکھی جائے گی یہ نہیں ہوگا کہ بُرائی کا پلڑا بالکل خالی ہو۔ اس کو صرف اونچا اور نیکی کے پلڑے کو نیچا ہونا چاہیے۔ بیڑا پار ہو جائے گا۔

اے دوست! مجھے یقین ہے کہ تم میں برائیاں کم اور خوبیاں زیادہ

نہیں۔ لہٰذا تمہارا انجام ضرور بخیر ہوا ہوگا۔

اے میرے خوش ذوق و خوش مذاق دوست! تم شاعر بھی تو تھے اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا کلام سن کر محظوظ ہوا کرتے تھے۔ دیکھو علامہ کیفی چریاکوٹی مرحوم کس قدر حسب حال فرماتے ہیں:

"وداعِ دوست" آساں مرگ مشکل
مگر ہر سانس کا سولی پہ ہے دم
ہوئی ہے موج دریا کی روانہ
ٹپکتا رہ گیا سر اپنا ساحل
غبارِ خاک مجنوں بھی تو آلے
ٹھہر او ساربان، ہاں روک محمل
چمن سے ٹوٹ کر زیب گلو ہے
سُنے گل کس طرح شورِ عنادل
ارے او دوریِ راہِ نظارہ
نگاہوں کو بھی ہو جانے دے شامل
جُدائی اور پھر شام جُدائی
دُہائی ہے تری اے ماہِ کامل
مدد ہاں المدد اے تابِ دیدار
چلا آیا تڑپ کر آنکھ میں دل
مبارک باد مرگِ منتظر کو
نہیں ہے زندگی جینے کے قابل
اندھیری شب ہے پروانے کدھر جائیں
اٹھالی کس نے آ کر شمعِ محفل
سمجھ میں اپنی کیفی آرہا ہے
یہی ہے مرگ ہجوری کا حاصل

تن از ہمراہی او ماند محروم
مگر جاں میرود منزل بمنزل

جناب ایس۔ ایم۔ یوسف صاحب کا ۷ر ستمبر ۱۹۷۰ء کو قریب پانچ بجے شام اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ اسی روز رات کو دفن

ہوئے۔ ۹ کو ان کے دولت خانہ پر فاتحہ سوئم ہوئی اور ۱۲ ستمبر کو پانچ بجے شام صدر دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس میں زیر صدارت حضرت علامہ ابن حسن جارچوی ایک نہایت پُراثر جلسۂ تعزیت ہوا جس میں مرحوم کے خویش مسٹر آل احمد بی اے (علیگ) و مولانا ظاہر قاسمی صاحب نے تلاوت کلام پاک فرمائی۔ جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب۔ مرزا علی اظہر برلاس، بیگم لفٹننٹ کرنل شہاب الدین صدیقی، کیپٹن سید واصف علی ایم اے، مسٹر عقیل احمد خاں ایڈووکیٹ اور مسٹر حسن علی عبدالرحمٰن بار ایٹ لا نے تقریریں فرمائیں۔ نیز جملہ حاضرین نے دعائے مغفرت کی۔ اس جلسہ میں مرحوم کے صاحبزادے صاحبزادیاں، بہوئیں۔ دوسرے عزیز و اقارب اور کافی تعداد میں دیگر احباب شریک ہوئے۔

(ستمبر ۱۹۷۰ء)

سیّد عابد علی عابدؔ

افسوس ہے کہ ۲۰ر جنوری ۱۹۷۱ء کو پاکستان کے مشہور شاعر و ادیب جناب سید عابد علی عابدؔ کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال ہو گیا۔ عابد صاحب ایک کامیاب ادیب اور مورخ تھے۔ عرصہ تک دیال سنگھ کالج لاہور میں شعبۂ فارسی کے چیرمین اور بعد ازاں پرنسپل رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ مجلس ترقی ادب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مرحوم بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ آپ کی پوری زندگی خدمت علم و ادب میں گذری اللہ تعالیٰ شرفِ قبول عطا فرمائے۔

(مارچ ۱۹۷۱ء)

روشؔ صدیقی

باکمال شاعر اور عزیز دوست روشؔ صدیقی ۲۲/جنوری ۱۹۷۱ء کو بمقام شاہجہاں پور (بھارت) انتقال کر گئے۔ بے پناہ رنج اور صدمہ ہوا۔ ہمارے بزرگ اور روشؔ مرحوم کے خسر جناب مظہر جلیل شوقؔ نے اس حادثہ کی یہ تفصیل لکھی ہے کہ "۲۲/جنوری کو میرٹھ سے شاہجہاں پور جا کر مشاعرہ میں شرکت کی جس کی صدارت یو۔پی کے گورنر مسٹر گوپال ریڈی کر رہے تھے۔ سب سے آخر میں ۳ بجے شب روشؔ صاحب نے اپنے مخصوص انداز و لہجہ میں پوری قوت کے ساتھ غزل پڑھی۔ سامعین کے اصرار پر دوسری غزل شروع کی لیکن چند شعر پڑھ کر بیٹھ گئے۔ کہ مجھے سینے میں درد محسوس ہونے لگا ہے۔ میزبان کے ساتھ اٹھ کر اپنے کمرے میں لیٹے۔ فرمائش کی کہ کوئی یٰسین شریف پڑھتا۔ اسلامیہ کالج شاہجہاں پور کے ایک حافظ قرآن طالب علم اتفاق سے موجود تھے۔ انہوں نے یٰسین شریف پڑھنا شروع کی۔ اور

روشن صاحب کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے اللہ کے حضور میں جا پہنچے۔"

"۲۳ کی صبح کو میرٹھ اور دہلی میں آن کی آن میں خبر عام ہوگئی۔ ان سے محبت رکھنے والے جوق در جوق ان کے مکان پر آنے لگے۔ دن بھر گھر ماتم کدہ بنا رہا۔ رات کے گیارہ بجے شاہجہاں پور سے ان کی میت میرٹھ پہنچی۔ ایک بجے بکثرت لوگ ان کے مکان پر آنے لگے۔ دن بھر گھر ماتم کدہ بنا رہا۔ ایک بجے شب کو جنازہ اٹھایا گیا۔ میرٹھ کی شدید سردی اور ابر آلود تاریک رات کے باوصف ہزار پندرہ سو ہندو مسلمان آدمی انہیں آخر منزل تک رخصت کرنے پہنچے۔ اور مقدس بزرگ حضرت شاہ ولایت رح کے جوار میں ٹھیک تہجد کے وقت جس کا انہیں بڑا شوق تھا آخری آرام گاہ میں پہنچا دیئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہمہ جنت سے بہر سالِ رحلت یہ ندا آئی
کہ سو آرام سے یادِ خدا اُحبّ پیمبر ہیں

۳ + ۱۳۸۷ = ۱۳۹۰ھ

حضرت شوق اپنے قابل فخر خویش روشن صدیقی سے ان کی بے مثل سعادت مندی اور قابلیت کی بنا پر بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ولی افسوس ہے کہ ان کی ضعیفی اور کمزوریٔ صحت کے عالم میں ان کو اس سانحۂ عظیم سے دوچار ہونا پڑا۔ شوق صاحب کے رنج و الم

کا اندازہ ان کے درج ذیل قطعۂ تاریخ وفات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

بس اب ڈھونڈا کرو اے شوقؔ جذب قلب مضطر میں
روشؔ کب کے گئے۔ پہنچے مقام قرب داور میں
سرِ جنت سے بہر سالِ رحلت یہ صدا آئی
"کہ سو آرام سے یادِ خدا حبِ پیمبر میں

۳ + ۱۳۸۷ = ۱۳۹۰ھ

روشؔ صاحب ہمارے بھی دیرینہ عزیز دوست تھے۔ جب بھی کراچی آتے دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس میں ضرور کرم فرماتے اور جہاں جہاں ان کے اعزاز میں ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں ان میں وہ ہمیں خاص طور پر مدعو کراتے تھے۔ بڑے خلیق، خوش مزاج، پُرخلوص اور پُرجوش آدمی تھے۔ کلام بے انتہا جاندار ہوتا تھا۔ اور پھر ان کے پڑھنے کا رزمیہ انداز ہمیشہ ناقابلِ فراموش رہے گا۔ نظم کے تو وہ بادشاہ تھے۔ اور ان کی قومی نظمیں بے مثل ہوتی تھیں۔ گذشتہ تیس پینتیس سال کے عرصہ میں انہوں نے بڑی شہرت پائی اور بڑا نام پیدا کیا۔ ان کا شمار چوٹی کے شعراء میں تھا۔ افسوس کہ مرحوم نے بہترین صحت ہونے کے باوجود صرف ۵۹ سال کی عمر پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کو عقبیٰ میں مقام رفیع میسر آئے اور ان کے جملہ پسماندگان بالخصوص ہمارے محترم حضرت شوقؔ صاحب کو صبرِ جمیل نصیب ہو۔ آمین۔ (مارچ ۱۹۷۰ء)

مولانا احترام الدین احمد شاغل جے پوری

راجستھان کے بابائے اُردو حضرت شاغل کا ۲۰ رجنوری ۱۹۷۱ء کو جے پور میں انتقال ہوگیا مرحوم کو ہمارے ادارہ سے، ہماری شائع کردہ کتابوں اور ہمارے رسالہ سے گہری دلچسپی تھی اور اسی بنا پر آپ کے رشحات قلم العلم میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ جے پور اپنی عمارتوں اور جواہرات کی تجارت کے لئے جس طرح مشہور تھا اسی طرح اپنے ان فرزندوں کے باعث بھی برصغیر پاک و ہند میں شہرت یافتہ تھا۔ جنھوں نے علم و ادب کے میدان میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ ان ہی لائق فخر فرزندوں میں ایک نہایت نمایاں شخصیت جناب شاغل کی بھی تھی۔ آپ ایک عظیم مذہبی گھرانے کے فرد اور قدیم عظمت و شرافت کی نشانی تھے۔ آپ کی ہستی جامع الصفات اور جے پور کی ادبی و ثقافتی زندگی کی جان تھی۔ آپ اورنیٹل کالج جے پور میں عرصہ تک عربی و فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ بلند پایہ شاعر اور مصنف تھے۔ آپ نے اپنی یادگار متعدد بلند پایہ تصانیف چھوڑی ہیں۔

بالخصوص آپ کا مجموعۂ کلام تو لافانی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ آپ نے اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے زندگی بھر پُرجوش کام کیا۔ اور آپ کی وجہ سے جے پور میں آئے دن نامور شعرا اور اہلِ علم آتے رہتے تھے۔ آپ ایک نہایت قیمتی کتب خانے کے بھی مالک تھے۔ جس میں بہت سی قلمی نادر کتب جمع کی گئیں تھیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ اُن کے انتقال کی وجہ سے جے پور کی علمی و ادبی زندگی میں جو عظیم خلا پیدا ہو گیا ہے وہ کسی لائق جانشین کی بدولت جلد از جلد پُر ہو جائے۔ آمین

(مارچ ۱۹۷۱ء)

ڈاکٹر امیر حسن صدیقی

کافی عرصہ سے دل کے مریض تھے، ساتھ ہی ہمہ وقت جذبۂ قومی سے سرشار رہتے تھے۔ اُن کا قلبی درد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ جونہی ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو انہوں نے ریڈیو پر سقوط ڈھاکہ کی خبر سُنی ان پر دل کا سخت دورہ پڑا، جو جان لیوا ثابت ہوا اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ بدایوں (یو۔پی) کے رہنے والے تھے۔ ستر سال کی عمر پائی اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں گزارا۔ وہیں میٹرک پاس کرنے کے بعد دفتر میں کلرک ہوگئے۔ اپنی انتھک محنت سے ڈاکٹر سر محمد ضیاء الدین احمد صاحب کو اپنے کام سے اس قدر خوش کیا کہ انہوں نے ان کو اپنا اسٹینو بنا لیا۔ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سایۂ عاطفت میں آنے سے ان کے جوش عمل میں مزید اضافہ ہوگیا اور انہوں نے ملازمت کے ساتھ ہی ساتھ اپنی اعلیٰ تعلیم کو بھی جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ تاریخ میں ایم اے کرلیا۔ اور پھر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی خصوصی سرپرستی کے باعث

ولایت چلے گئے۔ جہاں سے انہوں نے تاریخ میں پی۔ ایچ ڈی کیا۔ ولایت سے واپس آکر ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں اُستاد ہو گئے۔ اور بحیثیت اُستاد انہوں نے خوب نام پیدا کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی کراچی آ گئے اور اسلامیہ کالج کے پرنسل رہے۔ بعد ازاں ان کا تعلق کراچی یونیورسٹی سے ہو گیا جہاں ترقی کرتے کرتے "ڈین آف دی فکلٹی آف آرٹس" کے عہدۂ جلیلہ پر پہونچ گئے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ تعلیم و تعلّم کے علاوہ ڈاکٹر صاحب متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ علاوہ ازیں "جمیعت الفلاح" جیسا وقیع ادارہ قائم کیا۔ صدر کراچی میں اس کی اپنی عمارت بنائی اور کتب خانہ وغیرہ قائم کیا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے وہ "ضیاء الدین میموریل سوسائٹی" کے بھی روح رواں اور نائب صدر تھے۔ انھیں کی کوشش سے ہر سال سوسائٹی مذکور کے کامیاب سالانہ اجتماعات ہوتے رہے۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی مرحوم نے تین شادیاں کیں لیکن اولاد کسی بیگم سے نہ ہوئی۔ ان کی اولاد معنوی صرف وہ قومی ادارے ہیں۔ جو انہوں نے قائم کئے اور یا اُن کی بے لوث خدمت کی۔ مرحوم بڑے خوش مزاج، زندہ دل اور یاروں کے یار تھے۔ اپنے مخالفین سے بھی فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے کراچی کی علمی۔ تعلیمی اور ثقافتی زندگی میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے جو بمشکل پُر ہو سکے گا۔ (دسمبر ۱۹۷۱ء)

حضرت گویا جہان آبادی مرحوم

افسوس ہے کہ ہمارے فاضل بزرگ اور قدیم مہربان گویا صاحب ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ساڑھے گیارہ بجے شب انتقال فرما گئے۔ مرحوم جہان آباد ضلع پیلی بھیت روہیلکھنڈ یوپی کے رہنے والے تھے۔ ۱۶ جنوری ۱۸۹۲ء کو ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ شادی غالباً پیلی بھیت ہی میں ہوئی اور ہمیں وہیں ان سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ کچہری میں کسی ذمہ دار عہدہ پر فائز تھے اور اسی سلسلے میں آپ بریلی میں بھی عرصہ دراز تک خاص میرے محلہ میں مقیم رہے۔ کافی ربط و ضبط تھا جس کی بناء پر آپ کو قریب سے دیکھنے اور آپ کے فضل و کمال کو جاننے اور اس سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ پاکستان آکر میں نے موصوف کی سب سے چھوٹی صاحبزادی کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کی جس کی بناء پر وہ میرے عزیز قریب بھی ہو گئے تھے۔

گویا صاحب ایک بلند پایہ فلسفی اور قادر الکلام شاعر و ادیب تھے۔ نثر اور نظم میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن کے سبب اُن کو ملک کے چوٹی کے اہل علم حلقوں میں ایک مقام رفیع حاصل تھا۔ کچھ عرصہ ہوا ہم نے العلم میں آپ کی خدماتِ علمی اور دوسرے کمالات کے متعلق ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس کو ڈاکٹر عبدالغفور بسمل مرحوم مغفور نے سُپردِ قلم کیا تھا۔

کراچی میں آپ کے کافی مداح تھے جن میں سرفہرست جناب ممتاز حسن صاحب اور جناب سید ہاشم رضا صاحب تھے ان دونوں اکابر نے ہم سے بالمشافہ اور فون پر نہایت پُر شوکت الفاظ میں جناب گویا صاحب کا ذکر خیر کیا اور تعزیت کی۔

جناب ممتاز حسن صاحب نے درج ذیل تعزیتی خط بھی ارسال فرمایا۔

کراچی

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء

مکرمی جناب سید صاحب

ضامن نقوی گویا جہان آبادی مرحوم و مغفور کے متعلق چند تفصیلات ارسال خدمت ہیں۔ یہ تفصیلات میری درخواست پر مرحوم کے صاحبزادے نیّر اعظم نے مجھے بہم پہونچائی ہیں۔ یہ نوٹ اُنہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دو باتیں میں اپنی طرف سے اضافہ کروں گا۔ ایک تو یہ کہ گویا مرحوم کی ایک مثنوی "اسرارِ ہستی"

کی تعریف اقبال نے کی۔ اقبال کا خط میں نے دیکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ گویاؔ مرحوم کہتے تھے کہ اقبال کی نظم "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" جو بالِ جبریل میں شامل ہے خود گویاؔ مرحوم کے متعلق لکھی گئی ہے۔ اور اس میں اُنہی سے خطاب ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ "العلم" میں گویاؔ مرحوم کی علمی۔ ادبی، مفکرانہ اور شاعرانہ شخصیت کے شایانِ شان مقالہ لکھیں گے۔

افسوس ہے کہ گویاؔ کو اپنی زندگی میں وہ مقام حاصل نہ ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی وجہ ان کی تنگ دستی اور ہماری کور ذوقی ہے اگر اُن کے پاس پیسہ ہوتا اپنی کتابیں خود چھپواتے۔ پارٹیوں میں جاتے۔ محفلوں میں چمکتے۔ چندے دیتے اور تعریفیں کرواتے تو مجھے یقیناً آج یہ خط آپ کو یا کسی اور کو لکھنا نہ پڑتا۔

مخلص

ممتاز حسن

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں مقامِ اعلیٰ نصیب کرے۔ ان کی خدماتِ عالیہ کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور ان کی بیگم صاحبہ نیز سب بچوں کو صبرِ جمیل ارزانی فرمائے۔ آمین۔ (دسمبر ۱۹۷۱ء)

مولانا حسن ریاض مرحوم ــــــ چند یادیں

برّصغیر پاک و ہند کے مشہور صحافی اور تحریک پاکستان کے ممتاز ممتاد جناب سید حسن ریاض کا ۱۸/ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو وصال ہوگیا۔ مرحوم کی ذات کے ساتھ بہت سی تاریخی اہمیت رکھنے والی یادیں وابستہ ہیں۔ مجھے حسن ریاض صاحب سے اُس وقت سے شرفِ نیاز حاصل تھا جب وہ سید جالبؔ دہلوی مرحوم کے اخبار "روزنامہ ہمدم لکھنؤ" کے ادارۂ تحریر سے وابستہ تھے۔ جب سید جالبؔ صاحب کا "ھمدم" سے تعلق منقطع ہوا اور انہوں نے روزنامہ "ہمت" جاری کیا تو حسن ریاض صاحب بھی اسی میں کام کرنے لگے۔ سید جالبؔ صاحب کے انتقال کے بعد روزنامہ "ہمت" کے مدیر اعلیٰ ہوگئے۔ اور اس پرچہ کو وہ نہ صرف ایڈٹ کرتے تھے بلکہ اسے زندہ رکھنے کے لئے سرمایہ بھی فراہم کرتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں وہ میرے پاس بریلی بھی تشریف لائے اور میں نے وہاں فراہمی سرمایہ میں ان کو ممکنہ مدد دی اور

اخبار کی توسیع اشاعت کے لئے بھی جد وجہد کی گئی۔ لیکن یہ اخبار زیادہ دنوں نہ چل سکا اور مالی مشکلات کے باعث اُس نے دم توڑ دیا۔ روزنامہ "ہمت" کو حسن ریاض صاحب نے ان تمام خصوصیات کا حامل بنایا۔ جو سید جالب صاحب کے زمانہ میں اُس کا طرۂ امتیاز تھیں۔ روزانہ خبروں کے علاوہ جن کی سرخیاں متانت و سنجیدگی لئے ہوئے ہوتی تھیں۔ بلا ناغہ چند معلومات افزا مقالات بھی ضرور ہوتے تھے۔

۱۹۳۲ء میں بمقام سلیم پور ہاؤس لکھنؤ ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد ہوئی اور میں اس میں شرکت کے لئے گیا تو میں نے دیکھا کہ حسن ریاض صاحب اس کے خاص کارکنوں میں سے ہیں۔ ملک کے طول و عرض سے کثیر تعداد میں جو اکابر جمع ہوئے تھے۔ ان سب سے حسن ریاض صاحب بے تکلف باتیں کرتے تھے۔ جلسوں کے وقفہ کے دوران ایک کمرہ میں یہ منظر دیکھا کہ تصدق احمد خاں شروانی صاحب اور ڈاکٹر سید محمود صاحب کے ساتھ حسن ریاض صاحب کسی قومی مسئلہ پر نہایت زور شور سے بحث کر رہے تھے اور یہ بزرگ ان کی رائے کو خاصی اہمیت دے رہے تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر دفتر دریا گنج دہلی میں قائم ہوا اور روزنامہ "منشور" اس کے آرگن کے طور پہ جاری ہوا تو حسن ریاض صاحب اس کے چیف ایڈیٹر مقرر کئے گئے۔ مسلم لیگ ہاؤس

کی چھت کے ایک کشادہ کمرہ میں وہ تنہا رہتے تھے۔ نشست اور لکھنے پڑھنے کا کام فرش پر ہوتا تھا۔ میں جب بھی دہلی جاتا تو میرا معمول تھا کہ مسلم لیگ ہاؤس میں جناب سید شمس الحسن صاحب ان کے بھائی سید بدر الحسن صاحب اور مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد حسن ریاض صاحب کے کمرہ میں چھت پر چلا جاتا تھا۔ مُحلّا بالطبع ہو کر ان کے کمرہ میں آرام کرتا۔ جہان بھر کے قومی مسائل پر باتیں ہوتیں اور ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتا۔ اس کھانے میں صرف بکری کا بھُنا گوشت اور گرم گرم چپاتیاں ہوتی تھیں جن کی لذت مجھے کبھی فراموش نہ ہوسکی۔ حسن ریاض صاحب بڑے اہتمام کے ساتھ حقہ بھی پیتے تھے۔ اس زمانہ میں ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ کسرتی جسم معلوم ہوتا تھا۔ اس پر مستزاد بڑی بڑی روشن آنکھیں اور چہرہ پر مسلسل مسکراہٹ نے ان کو ہر درجہ جاذب نظر بنا دیا تھا۔ میں نے بارہا حضرت مولانا حسرت موہانی کو بھی حسن ریاض صاحب کے یہاں بیٹھے ہوئے پایا۔ دونوں کے درمیان بڑی آزادانہ اور مخلصانہ باتیں ہوتی تھیں۔ میری طرح مولانا بھی حسن ریاض صاحب کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تھے۔ ملاقاتوں کا یہ دور قیام پاکستان ۱۹۴۷ء تک چلتا رہا۔ کراچی آکر حسن ریاض صاحب کی زندگی یکسر منقلب ہوگئی ان کی طبیعت میں خودداری کا مادہ ضرورت سے

زیادہ تھا اور وہ سیاسی امور میں اپنی رائے یا قلم کو کسی کا تابع نہ بنا سکتے تھے۔ لہذا کراچی سے جاری ہونے والے روزناموں میں ان کی کسی میں کھپت نہ ہو سکی۔ شہید ملت خان لیاقت علی خاں مرحوم و مغفور سے ان کے گہرے تعلقات تھے لیکن پاکستان میں یہ تعلقات ان کے کام نہ آسکے۔ ع

راہ میں ہم ملیں کہاں کوئی ہمیں بلائے کیوں

حسن ریاض صاحب نے ایک ہفتہ وار ذاتی پرچہ جس کا نام "مقاصد" تھا کراچی سے جاری کیا جس کا دفتر نکل روڈ پر پی۔ ایم۔ اے بلڈنگ میں واقع تھا۔ میرا آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا دفتر قریب ہی سندھ مدرسہ میں تھا۔ اس لئے از سر نو جلد جلد ملاقاتیں ہونے لگیں لیکن اب ان ملاقاتوں میں وہ پرانی سی چہل اور خوشدلی کہاں۔ نہ وہ ولولے اور امنگیں اور نہ کام کرنے کے منصوبے۔ ہر ملاقات کچھ اس قسم کی ہوتی تھی کہ ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

شہید ملت لیاقت علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۵۸ء تک پاکستان میں مسلم لیگ کی وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں جن کے نام سربراہ حسن ریاض صاحب سے واقف اور ان کی خدمات کے معترف تھے لیکن ان کی سرپرستی کسی نے نہیں کی۔ اخبار "مقاصد"

بھی بند ہوگیا اور وہ بہار کالونی (مسان روڈ) میں عرصہ دراز تک گوشۂ گمنامی میں ایام گذاری کرتے رہے لیکن چونکہ لکھنے پڑھنے کی عمر بھر کی عادت تھی۔ لہذا اس دوران میں انہوں نے ایک معرکتہ الآرا کتاب "پاکستان ناگزیر تھا" لکھ ڈالی۔ کتاب طبع کرانے میں انہیں دربدر کی بہت ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ میرے غریب خانہ پر بھی تشریف لائے تھے۔ اور مجھے شدید صدمہ ہے کہ میں ان کی اس سلسلہ میں کوئی خدمت نہ کرسکا۔ بہرحال کتاب کسی نہ کسی طرح چھپ گئی اور وہ قیامت تک ان کی زندہ یادگار رہے گی۔ کراچی یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے کچھ عرصہ سے حسن ریاض صاحب کو اپنے شعبۂ صحافت میں جز وقتی لکچرار مقرر کردیا تھا جس کی وجہ سے ان کے آخری ایام حیات بالکل ناداری کی حالت میں بسر نہ ہوئے۔ افسوس ہے کہ مولوی حسن ریاض اور ان جیسے ہزاروں ہزار معماران پاکستان کا وقت پاکستان میں اچھی طرح نہ گذرا۔ اس کے برعکس ان لوگوں کو خوب مزا آیا۔ جنہوں نے پاکستان بنانے کے لئے ایک تنکا بھی نہ اٹھایا۔ عروس البلاد کراچی میں لاتعداد کارنشین ہیں، جن کی نئے نئے ماڈل کی گاڑیوں کو دن رات دیکھ کر آنکھیں چکاچوند ہوتی ہیں۔ حسن ریاض کی قسمت میں یہ تھا کہ وہ فیڈرل بی ایریا سے بلڈ پریشر

کی حالت میں بس پر سوار ہوں اور دھکے کھاتے ہوئے بارہ میل کے فاصلے پر کراچی یونیورسٹی روزانہ آتے جاتے ہیں.

مرحوم کے متعلق آخر میں ایک بات اور لائق ذکر ہے کہ گذشتہ پچیس ۲۵ سال کے عرصہ میں سرکاری نیم سرکاری اور نجی سطح پر کراچی میں سیکڑوں جلسے اور تقریبات ہوئیں جن میں مولانا حسن ریاض کبھی نظر نہ آئے۔ کسی نے ان کو بلانے کے قابل ہی نہ سمجھا ہوگا ——— فاعتبروا یا اولی الابصار

(۱اکتوبر ۱۹۷۲ء)

ڈاکٹر سیّد محمود

۲۶ مئی ۷۰ء بروز سہ شنبہ دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس میں بوقت ۶ بجے شام علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق وزیر تعلیم بہار و ممبر پارلیمنٹ بھارت سے ملاقات کی تقریب میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے راقم نے عرض کیا کہ :-

آپ یو۔ پی کے ایک معزز خاندان کے فرد ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ عرب سے آکر لودھیوں کے عہد میں صوبۂ بہار کی سرحد کے قریب سید پور نعیری ضلع غازی پور میں آباد ہوئے۔ اکبر بادشاہ دورے پر ایک مرتبہ ادھر سے گذرے تو آپ کے بزرگ شانِ استغنا کے باعث بادشاہ سے ملاقات کے لیئے نہ گئے۔ مگر پھر بھی بادشاہ نے ڈھائی لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر بخش دی۔ آپ کے بڑے چچا نے مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ سرحد میں سکھوں سے جہاد کیا۔ اور شہید ہوئے۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر بیاسی سال ہے اور جلسہ میں تشریف فرما ہمارے محترم استاد پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب تراسی سال کے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ اسکول میں داخل ہوئے اور قریشی صاحب ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ میں آنے کے لحاظ سے ڈاکٹر سید محمود سنیر ہیں۔ اور قریشی صاحب جونیر مگر عمر کے لحاظ سے قریشی صاحب ڈاکٹر صاحب سے سینیر ہیں۔

علی گڑھ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھیوں میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی۔ مولانا حسرت موہانی۔ قاضی تلمذ حسین اور ہمعصر بزرگوں میں نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک جیسی عالی مرتبت شخصیتیں ہیں۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی اور مولانا شبلی جیسے اہل علم حضرات شامل ہیں۔ آپ زمانہ طالب علمی ہی سے زبردست قومی جذبہ سے سرشار تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء کی مشہور اسٹرائک میں نمایاں حصہ لیا۔ اور نواب محسن الملک آپ کے اس قدر معترف ہوئے کہ اپنا آنریری پرائیویٹ سکریٹری مقرر کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ میں عرف عام میں "قوم" کہا جاتا تھا۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہوکر ڈاکٹر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ اور جرمنی گئے۔ وہاں سے آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی اور بار ایٹ لا کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۱۳ء میں آپ ہندوستان واپس آئے۔ اس وقت جنگ بلقان ہو رہی تھی۔ آپ

نے پٹنہ ہائی کورٹ میں ۱۹۲۱ء تک پریکٹس کی۔ مجھے جہاں تک علم ہے آپ کی شادی بہار کے مشہور بیرسٹر مظہر الحق صاحب کی بھانجی سے ہوئی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں آپ تحریک ترک موالات میں شامل ہو گئے اور کانگریس میں شامل ہو کر آپ نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حتیٰ کہ قید و بند کی مصیبتیں بھی اٹھائیں۔ کوئٹ انڈیا تحریک میں جوش و خروش سے حصہ لے کر مولانا ابو الکلام آزاد کے ہمراہ قلعہ احمد نگر میں کئی سال تک نظر بند رہے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور عرصہ تک کانگریس کی تنظیم کی۔ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے ماتحت جب صوبائی وزارتیں قائم ہوئی تو بہار کے چیف منسٹر ہونے کا آپ کا حق تھا مگر ایجوکیشن اور محکمہ زراعت کے منسٹر بنائے گئے۔ مجھے بھی اس زمانہ میں آپ کے دولت خانہ پر بہ ہمراہی مولانا سید طفیل احمد صاحب و مولوی نظامی بدایونی صاحب قیام کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

۱۹۳۶ء میں جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس زیر صدارت جناب مولوی فضل حق شیر بنگال بمقام پٹنہ آپ کی دعوت پر منعقد ہوا تو سیاسی اختلاف کے باوجود آپ نے مسلم لیگی حضرات پر مشتمل مجلس استقبالیہ بنوائی۔ چنانچہ اجلاس میں اردو کی حمایت میں زوردار تقاریر ہوئیں اور کانگریس پر سخت تنقید کی گئی پھر بھی آپ نے جلسہ کو کامیاب بنایا۔

قیام پاکستان کے بعد اکثریت نے جو تعصب اور تنگ نظری اقلیت کے ساتھ برتی اس سے متاثر ہوکر ڈاکٹر سید محمود صاحب نے ۱۹۶۰ء میں مسلمانانِ بھارت کا ایک کنونشن منعقد کیا اور "مجلس عمل" کی تنظیم کر کے بھارت گورنمنٹ کو اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت کی طرف پُر زور توجہ دلائی۔ آپ بھارتی پارلیمنٹ کے رکن بھی رہے۔ اور مرکزی حکومت میں نائب وزیر خارجہ کا عہدہ سنبھالا۔ آپ ایک اچھے مؤرخ اور اعلیٰ ادیب ہیں۔ دیوانِ غالب پر آپ نے ایک مقدمہ لکھا ہے اس کو ہم نے "العلم" کے غالب نمبر میں شائع کیا ہے۔ آپ نے متعدد تاریخی کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جب عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ تو آپ نے ڈاکٹر صاحب کا نام پرو وائس چانسلرشپ کے لئے تجویز کیا تھا۔ مگر آپ نے سیاسی مصروفیات کے باعث اس عہدہ پر فائز ہونے سے انکار کر دیا

نرذ

اوائل جولائی ۱۹۷۰ء میں پاکستان سے ہندوستان واپس جانے کے بعد صحت مسلسل خراب رہی۔ مزید براں اُن کو ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کا سخت حادثہ پیش آیا۔ ہڈی جڑ تو گئی لیکن کمزوری اس قدر بڑھ گئی کہ طرح طرح کے امراض نے انہیں گھیر لیا۔ بالآخر نئی دہلی کے ایک اسپتال میں ۲۷ر اور ۲۸ر ستمبر ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ۲۸ر کی شام کو تدفین عمل میں آئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے قبرستان میں، ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر انتقال کے وقت ۸۳ سال تھی۔

جناب ڈاکٹر صاحب کانگریس کے عظیم رہنما ہونے کے باوجود ہمیشہ مسلمان پہلے رہے اور مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی بے لوث خدمت میں آپ نے کبھی کوتاہی نہ کی تا آنکہ گذشتہ سالوں میں جب مسلم اقلیت پر ہندوؤں کے مظالم کی حد و انتہا ہوگئی تو آپ نے "مسلم مجلس" کی قیادت سنبھالی۔ اور الیکشنوں میں مسلمانوں کے مخلص نمائندوں کو بڑی تعداد میں کامیاب کرایا۔ راقم سے ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کو ۱۹۳۰ء سے تخصیص تھی اور ان کی نوازشاتِ پیہم کی داستان بہت طویل ہے۔ اب جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کسی اپنے عزیز ترین بزرگ سے ہمیشہ کے لئے مفارقت ہو گئی۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہمارے محترم ڈاکٹر سید محمود صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ آمین۔

(سنہ ۱۹۷۰ء و سنہ ۱۹۷۱ء)

مرحوم ضیاء الاسلام

دلی رنج و افسوس ہے کہ ۲۴ر اگست ۱۹۷۶ء کو ہمارے نہایت عزیز و محترم دوست جناب ضیاء الاسلام صاحب اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال فرما گئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی دسویں برسی کے جلسہ میں تقریر کر کے بیٹھے ہی تھے کہ دل کا دورہ پڑ گیا اور آناً فاناً ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ضیاء الاسلام صاحب بڑے وجیہہ اور سجیلی شخصیت کے مالک تھے۔ پھر اس پر بے حد خوش پوشاک تھے۔ دوستوں سے دوستی اور مخالفوں سے مخالفت جوش و خروش کے ساتھ کرنے کی عادت تھی۔ رہنے والے تو ریاست جے پور کے تھے لیکن اعلیٰ تعلیم اور ملازمت یو۔پی میں رہی، ان کا شمار قبل تقسیم صوبہ کے نامور ڈپٹی کلکٹروں میں تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ شعر و ادب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اور شعراء اور ادیبوں کو مسلسل اپنے گرد جمع رکھتے تھے۔ جہاں جاتے اپنے اثر و رسوخ سے شاندار آل انڈیا مشاعرے کراتے جس کی وجہ سے ملک کے نامور شعراء سے ان کی گہری دوستی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ انگریزی

روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کراچی کے کافی عرصہ تک چیف ایڈیٹر رہے۔ اور دنیائے صحافت میں بڑا نام پیدا کیا۔ جب اخبار بند ہوگیا تو پاکستان کی وزارت خارجہ میں ملازم ہو گئے۔ اور مختلف محکموں میں ڈائرکٹر رہے۔ بیرونی ممالک امریکہ اور یورپ وغیرہ بھی سرکاری وفود کے ساتھ گئے۔

ضیاء الاسلام صاحب لاجواب انگریزی لکھتے تھے۔ اور معلومات کا ایک بحر ذخار تھے۔ ملک و ملت کے سچے فدائی اور ہر قسم کی خرابیوں کے بے لاگ نقاد تھے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے قریب قریب سب جلسوں میں ذوق و شوق کے ساتھ شرکت فرماتے تھے۔ ایک دفعہ خاص ان کے اعزاز میں جلسہ کیا گیا جس کے وہ منفرد خصوصی تھے۔ راقم سے ہمیشہ بہت محبت کی۔ اور وہ میرے بہترین ساتھیوں میں سے تھے۔

افسوس دلا کہ غمگساراں رفتند شیریں دہنان و گل عذاراں رفتند
چوں بوئے گل آمدند بر باد، سوار در خاک چو قطرہ ہائے باراں رفتند

(اگست ۱۹۷۱ء)

مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں شروانی

حاجی محمد مقتدیٰ خاں شروانی ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۸ء بروز جمعہ بوقت ۹ بجے شب علی گڑھ میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ دو ڈھائی مہینے علیل رہے۔ مگر کیا مجال کہ کسی خط میں اپنی علالت یا بیماری کا ذکر تک کیا ہو۔ بڑے جاندار بزرگ تھے۔ علی گڑھ اور تحریکِ علی گڑھ کے فدائی سرسید کے دیکھنے والے خود سرسید اور اس دور کے بہت سے بزرگوں کے واقعات ان کو ازبر تھے۔ پرانے صحافی اور مصنف تھے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ وغیرہ کی ادارت میں شامل رہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی پریس اور شروانی پرنٹنگ پریس کے ناظم و نگراں رہے۔ ان کی زیرِ نگرانی مطبوعہ کتابیں ایک نظر میں پہچانی جاتی ہیں۔ کسی نے ان کو علی گڑھ کا نول کشور لکھا تھا۔ اور صحیح لکھا تھا۔ ان کے قلم میں روانی اور شگفتگی تھی۔ جس کی جھلک ان کے خطوط میں بھی نظر آتی ہے۔ بچوں کے لئے دینیات کا ایک سلسلہ پانچ حصوں میں لکھا تھا۔ جو بہت مقبول ہوا۔ اور مضامین تو بہت لکھے۔ عمر ۹۰ سے متجاوز پائی۔ اللہ مغفرت فرمائے خوب بزرگ تھے۔

ڈاکٹر نظام الدین

پچھلے دنوں جناب ڈاکٹر نظام الدین صاحب کا حیدر آباد دکن میں انتقال ہو گیا۔ عمر تقریباً ۷۰ سال پائی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں فارسی کے پروفیسر رہے۔ اور پھر مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف کے ڈائرکٹر رہے۔ اور اس طرح انہوں نے اپنی تمام زندگی علوم و فنون کی خدمت میں گذار دی۔ مشہور مستشرق پروفیسر براؤن کے شاگرد تھے۔ جس کی ہسٹری آف پرشین لٹریچر مشہور زمانہ ہے۔ خود بھی نامور فاضل اور محقق تھے۔ بلکہ علم و فضل ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ابھی حال میں انہوں نے دو کتابیں "ملوک الملوک" از فضل اللہ روزبہان اور "جوامع الحکایات" از عوفی مرتب کر کے شائع کی تھیں۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کا ۵ دسمبر ۱۹۶۸ء کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ مغفرت فرمائے۔ انہوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزار دی علامہ سید سلیمان ندوی کے عزیز قریب تھے۔ علمی دنیا میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ "رقعاتِ عالم گیری" کی ترتیب ہے۔ اور اس کا مقدمہ اس سے بھی بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔

وہ اسماعیل اندھیری کالج بمبئی میں پروفیسر تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے بمبئی ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور وہاں اردو کے لئے مسیحا ثابت ہوئے۔ مشہور انجمن اسلام کے تحت تصنیف و تحقیق کا مرکز قائم کر دیا۔ اس کا سہ ماہی آرگن "نوائے ادب" علمی و ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ابھی حال میں ان کا ایک شاہکار گجراتی اردو کی لغت "گجراتی لغت" شائع ہوئی ہے۔ ندوہ کے لائق اور نامور فرزند تھے۔

رئیس احمد جعفری

جعفری صاحب اُردو زبان کے مشہور مصنف، مؤلف، مترجم، صحافی، ناول نویس اور ادیب تھے۔ ان کی کتابوں کی تعداد ۲۵۰ کے لگ بھگ ہے۔ اُردو مصنفین میں وہ نہایت خوش قسمت تھے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو اچھے خاصے لاہور اسٹیشن پر چہل قدمی کر رہے تھے کہ قلب کا دورہ پڑا اور رہگرائے ملک بقا ہوئے۔ لاش ہوائی جہاز سے کراچی لائی گئی اور یہیں دفن ہوئے۔ حضرت ریاض خیرآبادی کے بھائی نیاز احمدؒ مرحوم کے نواسے تھے۔ ندوہ اور جامعہ ملیہ میں تعلیم تحصیل کی۔ ان کی پہلی اور مشہور کتاب "سیرت محمد علی" تھی۔ بمبئی میں مولانا شوکت علی کے ساتھ رہے۔ "خلافت" اخبار نکالا۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی آگئے یہاں سے "خورشید" اخبار اور "ریاض" ماہنامہ نکالا۔ ۸۔۱۰ سال سے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ تھے۔ ۱۹۱۲ء کی پیدائش بتائی جاتی ہے۔ ۵۶ سال کی عمر پائی۔ راقم الحروف سے خصوصی تعلق خاطر تھا۔ جب بھی علائق دنیا سے نجات ملتی۔ گھنٹوں کرم فرماتے تھے۔

حکیم احمد شجاع

۴ر جنوری ۱۹۶۹ء کو ملک کے مشہور اہلِ قلم جناب حکیم احمد شجاع بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم علی گڑھ کے ممتاز اور قابلِ فخر اولڈ بوائے تھے۔ اعلیٰ ملازمتوں پر فائز رہنے کے باوصف کبھی قلم ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ایک سے ایک اعلیٰ کتاب لکھی۔ اور قریب قریب ہر صنفِ ادب میں شاہکار تحریریں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ڈرامہ نویسی میں خاص شہرت ہے۔ حکیم صاحب دار العلم لاہور کی آبرو تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اُن کی پُرخلوص خدماتِ ملی کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ آمین۔

[م۔ جھ۔ ر]

MAQALAT-I-BRELVI

(Essays of Brelvi)

BY

SYED ALTAF ALI BRELVI
B.A. (Alig.)

FOREWARD

BY

Prof. Mohd. Moinuddin Durdai
B.A. (Hons,), M.A. (Alig.)

ACADEMY OF EDUCATIONAL RESEARCH,
ALL PAKISTAN EDUCATIONAL CONFERENCE,
KARACHI - 1973